فہرست

شذرات	دیدۂ صورت پرست ماست	جاوید احمد غامدی	۲
	محمد عربی کی نبوت	〃 〃	۴
قرآنیات	آل عمران (۳: ۷۲-۷۶)	〃 〃	۷
معارف نبوی	قریش کے ابتدائی اہل ایمان کے لیے نبی کریم کی دعا	معز امجد	۱۱
	اہل کفر سے قتال	طالب محسن	۱۴
	نماز کے اوقات ــــــ حدیث ۹، ۱۰، ۱۱	ساجد حمید	۲۴
دین و دانش	اخلاقیات (۵)	جاوید احمد غامدی	۲۹
نقطۂ نظر	عورت کی امامت	پروفیسر خورشید عالم	۳۵
	اردو املا ــــــ چند گزارشات	عبدالستار غوری	۴۷
	صبر کیا ہے، اسے کیسے حاصل کریں؟ (۷)	ساجد حمید	۵۲

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

جاوید احمد غامدی

دیدۂ صورت پرست ماست

یہ ربیع الاول کا مہینا ہے۔ اس مہینے میں وہ ہستی عالم وجود میں آئی جسے خود عالم کے پروردگار نے رحمۃ للعلمین قرار دیا۔ جس کی پوشاک اور جس کی ران پر ابن مریم نے دیکھا کہ اس کا ایک نام لکھا ہوا ہے: خداوندوں کا خداوند اور بادشاہوں کا بادشاہ؛ وہ جو قیامت تک کے لیے سرور عالم ہے؛ جس کا قلم روزمین کے سارے کناروں تک پھیلا ہوا ہے؛ جسے جوامع الکلم عطا ہوئے؛ جس کے لیے ساری زمین مسجد بنا دی گئی؛ جس کی ہیبت سے کفر لرزہ براندام ہوا؛ جسے میزان عطا ہوئی اور اس کے ساتھ لوہا بھی کہ وہ اس کے ذریعے سے لوگوں پر خدا کی حجت ہر لحاظ سے پوری کر دے؛ جس پر نبوت ختم ہوئی؛ قرآن نازل ہوا اور جس کے بارے میں یہ فیصلہ لوح گیتی پر ثبت کر دیا گیا کہ صبح نشور تک اب خدا کی غیر متبدل ہدایت اس کی لائی ہوئی کتاب کے سوا کسی اور جگہ سے نہیں مل سکتی۔

وہ ہستی اسی مہینے میں منصۂ عالم پر جلوہ فرما ہوئی۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس کی نسبت سے یہ مہینا رشک دہر ہے اور جی چاہتا ہے کہ اس کا ایک ایک لمحہ جشن مسرت میں بسر ہو، لیکن یہ عجیب بات ہے کہ صدیق و فاروق، عثمان و حیدر اور بلال و بوذر نے، جن کی اس ہستی سے محبت و عقیدت کا سرمایہ ہی ان کا اثاث البیت تھا، نہ اس ماہ کو ''ماہ جشن'' بنایا اور نہ اس دن کو ''عید میلاد'' قرار دیا جس کی صبح درخشاں میں یہ دعاے خلیل اور نوید مسیحا پہلوے آمنہ سے ہویدا ہوئی۔ وہ اس دنیا میں تھے تو یہ دن بارہا طلوع ہوا اور یہ مہینا بارہا آیا، مگر ان کے شب و روز کا دریا اپنے راستے پر بہتا رہا۔ آسمان کی آنکھوں نے لمحہ بھر کے لیے بھی اس میں کوئی تموج نہیں دیکھا۔ یاللعجب، یہ ماجرا کیا ہے؟

''یوم اقبال''، ''یوم جناح'' ـــــــ اس ہستی کے مقابلے میں یہ لوگ ہی کیا تھے، لیکن ان کے مداح اگر ان کے

یوم پیدایش پر یہ اہتمام کر سکتے ہیں تو اس دانائے سبل، ختم الرسل، مولائے کل کے لیے کیوں نہیں، جس نے:

غبار راہ کو بخشا فروغ وادی سینا

میں برسوں اس خلجان میں مبتلا رہا، مگر للہ الحمد کہ بالآخر یہ عقدہ حل ہوا۔ حقیقت نمایاں ہوئی تو یہ حقیقت بھی واضح ہوئی کہ ہمارے فکر کی ساری نارسائیاں درحقیقت ہمارے زاویۂ نگاہ ہی سے پیدا ہوتی ہیں:

بر چہرۂ حقیقت اگر ماند پردۂ

جرم نگاہ دیدۂ صورت پرست ماست

بات دراصل یہ ہوئی کہ ہم نے اسے سب سے بڑا تو مانا، مگر انھی شخصیتوں کے زمرے سے مانا جن سے ہم مانوس تھے اور وہ اس زمرے کا شخص ہی نہ تھا۔ چنانچہ یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ اس زمین پر سارے دن اس کے تھے، مگر ہمارے لیے وہ ایک خاص دن میں پیدا ہوا؛ وہ ہر مہینے کا ماہ تاباں تھا، مگر ہم نے اسے جب دیکھا، ربیع الاول ہی کے مطلع پر دیکھا؛ تقویم خداوندی میں ہر سال اسی کے نام سے معنون تھا، مگر ہماری تقویم میں اس کا یوم ولادت ۵۷۰ بعد مسیح ہوا:

جرم نگاہ دیدۂ صورت پرست ماست

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

ہم نے چاہا کہ ہم سمندر کو کنوئیں میں بند کریں، صحرا کو صحن میں اتاریں اور آسمان کو ردا بنائیں، لیکن وہ جو اس کے ساتھی تھے ـــــ صدیق و فاروق، عثمان و حیدر، بلال و بوذر ـــــ انھوں نے سمندر کو سمندر، صحرا کو صحرا اور آسمان کو آسمان دیکھا، تب ان پر واضح ہوا کہ وہ جس کی یاد کی شمعیں ہر دل میں فروزاں رہنی چاہییں اور جس کا نام جب دن پہلو بدلے، ہر مسجد کے مناروں سے بلند ہونا چاہیے، یہ اس کی شان سے فروتر ہے کہ اسے ایک یوم میلاد اور ایک ماہ ربیع الاوّل کی شخصیت بنایا جائے۔ وہ عزیز از جاں اور عزیز جہاں ایک دن اور ایک مہینے کی شخصیت نہیں ہوسکتا۔ وہ تو ہر دن، ہر مہینے اور ہر سال کی شخصیت ہے، اس لیے نہ ''عید میلاد النبی'' نہ ''جشن ربیع الاوّل''، بلکہ صبح دم، دن ڈھلے، لدلوك الشمس الی غسق اللیل، **ایک ہی صدا اور ایک ہی نغمہ**: اشھد ان لااله الّا اللّٰه، اشھد ان محمدًا رسول اللّٰه.

یہ نغمہ فصل گل و لالہ کا نہیں پابند

بہار ہو کہ خزاں، لاالہ الا اللہ

[۱۹۹۰ء]

جاوید احمد غامدی

محمد عربی کی نبوت

اس دنیا میں جتنے بڑے آدمی ہوئے ہیں، اُن سب کے بارے میں یہ بات بغیر کسی استثنا کے اور بے خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ اپنے جس فکر و اسلوب کے حوالے سے وہ اب پہچانے جاتے ہیں، اس تک پہنچنے کے لیے اخذ و اکتساب اور ترک و اختیار کے اُن سب مراحل سے انھیں لازماً گزرنا پڑا جو ہر انسان کو اس راہ میں پیش آتے ہیں۔ وہ اپنی جن صلاحیتوں اور جس ذہنی اثاثے کے ساتھ دنیا کے سامنے آئے، اس میں بتدریج ترقی ہوئی۔ وہ رفتہ رفتہ نیچے سے اوپر کی طرف اٹھے۔ ان کے فکر و اسلوب میں درجہ بدرجہ تبدیلی ہوئی اور بہت کچھ ماننے اور پھر چھوڑ دینے کے بعد ہی وہ کسی مقام پر جا کر کھڑے ہوئے۔ اس سرزمین کی ایک نابغہ شخصیت اقبال کو دیکھیے۔ انھوں نے جو کچھ ابتدا میں کہا اور جس طرح کہا، وہ بھی ہمارے سامنے ہے اور ان کے قلم نے بعد میں جو لعل و گہر بکھیرے، انھیں بھی ہم دیکھتے ہیں۔ ہم نے ''مسجد قرطبہ'' بھی پڑھی ہے اور جس شخص نے اُردو نظم کا یہ تاج محل تخلیق کیا ہے، اس کے زمانۂ طالب علمی کا کلام بھی دیکھا ہے۔ اس بے مثال شاعر کی تخلیقات میں نقطۂ نظر کا جو ارتقا اور فکر و اسلوب کی جو تبدیلیاں ہم نے دیکھی ہیں، وہی ہم سقراط و فلاطون، کانٹ اور ہیگل، نیوٹن اور آئن اسٹائن، شیکسپیئر اور ملٹن اور رومی و حافظ کے ہاں بھی دیکھتے ہیں۔

لیکن وہ تنہا ہستی جس کے وجود سے یہ استثنا اب ہمیشہ کے لیے ثابت ہے، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ انھوں نے جو کلام دنیا کے سامنے پیش کیا، وہ قرآن مجید کی صورت میں ہمارے پاس موجود ہے۔ یہ کلام جب پہلی مرتبہ ان کی زبان سے لوگوں نے سنا، اس وقت وہ چالیس سال کے تھے۔ یہ سارا عرصہ وہ کہیں دشت و صحرا میں نہیں

رہے۔انھوں نے اپنی زندگی کے یہ چالیس سال اسی بستی میں گزارے جس میں وہ پہلی مرتبہ یہ کلام سنانے کے لیے لوگوں کے سامنے کھڑے ہوئے۔اس عرصے میں ان کی قوم کے ہر فرد نے، ان کی بیوی اور ان کے بچوں نے، ان کے احباب اور اہل خاندان نے شب و روز انھیں دیکھا۔ان کے بارے میں یہ تاریخ کی ناقابل تردید شہادت ہے کہ وہ کبھی اخذ واکتساب کے کسی مرحلے سے نہیں گزرے۔انھیں کسی نے کہیں مشق سخن کرتے نہیں دیکھا۔اس ساری مدت میں انھوں نے کسی چیز کے بارے میں اپنا کوئی فکر کبھی پیش نہیں کیا۔غرض یہ کہ اب ہم قرآن مجید میں جو کچھ پڑھتے ہیں، اس نوعیت کی کوئی چیز اس عرصے میں کسی شخص نے اُن کی زبان سے نہیں سنی۔وہ چالیس سال اسی طرح گزارنے کے بعد یک بیک کھڑے ہوئے اور یہ کتاب لوگوں کے سامنے پیش کرنا شروع کر دی، اور پھر کم و بیش تئیس سال تک مسلسل اسے پیش کرتے رہے۔اس دوران میں وہ اطمینان کے ساتھ کسی گوشے میں بیٹھے نہیں رہے۔انھوں نے جو دعوت پیش کی، اس سے ان کا پورا ماحول متاثر ہوا۔اُن کی قوم کے اکابر اپنے تمام وسائل کے ساتھ اُن کی مخالفت کے درپے ہوئے۔انھوں نے اور ان کے ساتھیوں نے اس راہ میں بڑے سخت مقام بھی دیکھے، یہاں تک کہ انھیں اس بستی سے ہجرت کر کے یثرب جانا پڑا۔وہاں انھیں بدر و احد کے معرکے بھی پیش آئے، یہود و نصاریٰ کی ریشہ دوانی سے بھی سابقہ پڑا، پھر اس چھوٹی سی بستی میں ان کی حکومت بھی قائم ہوئی اور بالآخر پورا جزیرہ نماے عرب اس حکومت میں شامل بھی ہوا۔لیکن وہ کلام جو ان تئیس برسوں میں انھوں نے پیش کیا، اس میں فکر کے لحاظ سے کسی ادنیٰ تضاد اور اسلوب کے اعتبار سے کسی معمولی ارتقا یا تنزل کی نشان دہی بھی کوئی شخص نہیں کر سکتا:

> ''پھر کیا یہ لوگ قرآن پر غور نہیں کرتے؟ اور (حقیقت یہ ہے کہ) اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس میں وہ بہت کچھ اختلاف پاتے۔'' (النساء ۴: ۸۲)

اس کا ہر جز ایک غایت درجہ مضبوط نظام فکر کا حصہ اور اس کی ہر سورہ اپنی نوعیت کا ایک منفرد شہ پارۂ ادب ہے۔اسے جس مقام سے پڑھیے، آدمی پکار اٹھتا ہے کہ:

کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جاست

پھر دیکھیے، یہ کلام اب ہمارے پاس جس کتاب کی صورت میں موجود ہے، اس پر کم و بیش چودہ صدیاں بیت گئیں۔اس عرصے میں دنیا کیا سے کیا ہو گئی۔بنی آدم نے نظریہ و خیال کے کتنے بت تراشے اور پھر خود ہی توڑ دیے۔ انفس و آفاق کے بارے میں انسان کے نظریات میں کتنی تبدیلیاں آئیں اور اس نے ترک و اختیار کے کتنے مرحلے طے کیے۔وہ کس کس راہ سے گزرا اور بالآخر کہاں تک پہنچا، لیکن یہ کتاب جس میں بہت سی وہ چیزیں بھی بیان ہوئی

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

ہیں جو ان پچھلی دو صدیوں میں علم و تحقیق کا خاص موضوع رہی ہیں، دنیا کے سارے لٹریچر میں بس ایک ہی کتاب ہے جو اس وقت بھی اسی طرح اٹل اور محکم ہے، جس طرح اب سے چودہ سو سال پہلے تھی۔ علم و عقل اس کے سامنے جس طرح اس وقت اعتراف عجز پر مجبور تھے، اسی طرح آج بھی ہیں۔ اس کا ہر بیان اب بھی پوری شان کے ساتھ اپنی جگہ پر قائم ہے۔ دنیا اپنی حیرت انگیز علمی دریافتوں کے باوجود اس میں کسی ترمیم و تغیر کے لیے کوئی گنجایش پیدا نہیں کر سکی:

> ''اور ہم نے اس کو حق کے ساتھ اتارا ہے اور یہ حق ہی کے ساتھ اترا ہے اور ہم نے تم کو اے پیغمبر، صرف اس لیے بھیجا ہے کہ (ماننے والوں کو) بشارت دو اور (جو انکار کریں، انھیں) خبردار کر دو۔'' (الاسراء ۱۷: ۱۰۵)

اس کے بعد پھر کیا چیز ہے جو انسان کو اس نبوت کے جھٹلانے پر آمادہ کرتی ہے؟

[۱۹۸۸ء]

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

جاوید احمد غامدی

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

آل عمران

(۱۶)

(گزشتہ سے پیوستہ)

وَقَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ: اٰمِنُوْا بِالَّذِیْٓ اُنْزِلَ عَلَى الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ، وَاكْفُرُوْٓا اٰخِرَهٗ، لَعَلَّهُمْ یَرْجِعُوْنَ﴿۷۲﴾ وَلَا تُؤْمِنُوْٓا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِیْنَكُمْ، قُلْ: اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ، اَنْ یُّؤْتٰٓى اَحَدٌ مِّثْلَ مَآ اُوْتِیْتُمْ

اور اہل کتاب کا ایک گروہ کہتا ہے کہ مسلمانوں پر جو کچھ نازل ہوا ہے، اُس پر صبح ایمان لاؤ اور شام کو اُس کا انکار کر دیا کرو تا کہ وہ بھی برگشتہ ہوں[۱۳۳]، اور اپنے مذہب والوں کے سوا کسی کی بات نہ مانا کرو ـــــ اِن سے کہہ دو، (اے پیغمبر) کہ ہدایت تو اصل میں اللہ کی ہدایت ہے[۱۳۴] ـــــ (اِس لیے نہ مانا کرو کہ) مبادا اِس طرح کی چیز

[۱۳۳] یہ انھی چالوں میں سے ایک چال ہے جو یہود نے اپنے اس منصوبے کے تحت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے مقابلے میں چلیں کہ آپ کے ساتھی بن کر آپ کو اور آپ کی دعوت کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی جائے۔ استاذ امام اس کی وضاحت میں لکھتے ہیں:

”... ان میں سے ایک چال یہ بھی تھی کہ ان کے لیڈروں نے اپنے کچھ آدمیوں کو اس بات کے لیے تیار کیا کہ وہ پہلے اپنے ایمان و اسلام کا اظہار و اعلان کر کے مسلمانوں کے اندر شامل ہوں، پھر اسلام کی کچھ خرابیوں کا اظہار کر کے اس سے علیحدگی اختیار کر لیا کریں۔ اس کا فائدہ انھوں نے ایک تو یہ سوچا ہوگا کہ اس طرح بہت سے جدید العہد مسلمانوں کا اعتماد اسلام پر سے متزلزل ہو جائے گا، وہ یہ سوچنے لگیں گے کہ فی الواقع اسلام میں کوئی خرابی ہے جس کے سبب سے یہ پڑھے

اَوْ يُحَآجُّوْكُمْ عِنْدَ رَبِّكُمْ، قُلْ اِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ، وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۷۳﴾ يَّخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ، وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿۷۴﴾

کسی اور کو بھی مل جائے جو تمھیں ملی ہے[۱۳۵] یا تم سے وہ تمھارے پروردگار کے حضور میں حجت کر سکیں[۱۳۶]۔ اِن سے کہہ دو کہ فضل تو اللہ کے ہاتھ میں ہے، جسے چاہتا ہے، عطا کر دیتا ہے اور اللہ بڑی وسعت اور بڑے علم والا ہے[۱۳۷]۔ وہ جس کو چاہتا ہے، اپنی رحمت کے لیے خاص کر لیتا ہے اور اُس کا فضل بہت بڑا ہے[۱۳۸]۔ ۷۳-۷۴

لکھے لوگ اسلام کے قریب آ کر اس سے بدک جاتے ہیں۔ دوسرا یہ کہ اس تدبیر سے وہ خود اپنی قوم کے عوام کو اسلام کے اثر سے بچالے جائیں گے، جب وہ یہ دیکھیں گے کہ ان کی اپنی قوم کے کچھ پڑھے لکھے لوگ اسلام کو آزما کر چھوڑ چکے ہیں تو ان کی وہ رغبت کمزور ہو جائے گی جو اسلام اور مسلمانوں کی کشش کے سبب سے ان کے اندر اسلام میں داخل ہونے کے لیے پیدا ہوتی تھی۔'' (تدبر قرآن ۲/ ۱۱۹)

[۱۳۴] یہ ٹکڑا سلسلۂ کلام کا جز و نہیں ہے، بلکہ جملۂ معترضہ ہے جس سے ایک غلط بات کی برسرموقع تردید فرما دی گئی ہے۔ اصل سلسلۂ کلام اس طرح ہے: 'ولا تومنوا الا لمن تبع دینکم ان یوتی احد' اور 'ان' سے پہلے 'مخافة' یا اس کے ہم معنی کوئی لفظ عربیت کے اسلوب پر حذف ہو گیا ہے۔ یہود جن لوگوں کو اپنے منصوبے کے مطابق ایمان لانے کے لیے بھیجتے تھے، انھیں بڑی شدومد کے ساتھ یہ تاکید بھی کر دیتے تھے کہ بنی اسرائیل سے باہر وہ کسی پیغمبر کی تصدیق نہ کریں۔ ان کی تمام ضلالت چونکہ اسی ایک بات پر مبنی تھی، اس لیے قرآن نے برسرموقع انھیں ٹوک دیا ہے کہ تعصب کا یہ کیسا جنون ہے جس میں یہ لوگ مبتلا ہیں۔ ان سے کہہ دو کہ اصل ہدایت تو اللہ کی ہدایت ہے، خواہ وہ کسی اسرائیلی پیغمبر سے ملے یا اسماعیلی سے۔ ہر شخص کو اسی کا طالب ہونا چاہیے۔ نجات اگر حاصل ہو گی تو اسی سے ہو گی۔ اس کا ذریعہ یہودیت یا نصرانیت نہیں ہے۔

[۱۳۵] یعنی ایسا نہ ہو کہ مذہبی قیادت کا جو منصب اس وقت تمھیں حاصل ہے، وہ کسی دوسرے کو بھی حاصل ہو جائے۔ اس سے اشارہ بنی اسمٰعیل کی طرف ہے جن کے اندر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی تھی۔ قرآن نے اسے مبہم اس لیے رکھا ہے کہ یہود یہ بات زبان سے نہیں کہتے تھے۔

[۱۳۶] یہ ان کے اس احمقانہ اندیشے کی طرف اشارہ ہے کہ اگر آج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں کوئی بات ان کے کسی آدمی کی زبان سے نکل گئی تو مسلمان اسے قیامت کے دن ان کے خلاف حجت بنائیں گے۔

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

وَمِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مَنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِقِنْطَارٍ يُّؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ ، وَمِنْهُمْ مَّنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِدِيْنَارٍ لَّا يُؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ ، اِلَّا مَادُمْتَ عَلَيْهِ قَآئِمًا ، ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ ، وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ، وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۷۵﴾ بَلٰى ،

(تم اِن سے توقع رکھتے ہو کہ تمھارے پیغمبر کے معاملے میں یہ انصاف کی بات کہیں گے[۱۳۹]) اور (اِدھر صورت حال یہ ہے کہ) اہل کتاب میں وہ لوگ بھی ہیں کہ اگر تم مال و دولت کا ڈھیر اُن کے پاس امانت رکھ دو تو وہ تمھیں ادا کر دیں گے اور وہ بھی ہیں کہ اگر تم ایک دینار بھی اُن کی امانت میں دے دو تو جب تک اُن کے سر پر سوار نہ ہو جاؤ، وہ اُس کو تمھیں ادا نہ کریں گے۔[۱۴۰] یہ اِس وجہ سے کہ اُنھوں نے کہہ رکھا ہے کہ اِن امیوں کے معاملے میں ہم پر کوئی الزام نہیں ہے۔[۱۴۱] اور (حقیقت یہ ہے کہ) وہ جانتے بوجھتے اللہ پر جھوٹ

---

[۱۳۷] یعنی اللہ تعالیٰ کے فیصلے تمھارے فیصلوں کی طرح تعصّبات پر مبنی نہیں ہوتے کہ ان میں کسی اور کے لیے گنجایش ہی نہ رہے۔ وہ بڑی وسعت اور بڑے علم والا ہے۔ اسے معلوم ہے کہ کون کس چیز کا مستحق ہے اور کون مستحق نہیں ہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

[۱۳۸] اس جملے میں جن دو باتوں کی طرف اشارہ ہے، ان کی وضاحت استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اس طرح فرمائی ہے:

> ”...ایک تو اس بات کی طرف کہ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت ایک عظیم اور بے پایاں برکت و رحمت ہے۔ دوسری اس بات کی طرف کہ یہ بنی اسمٰعیل پر اللہ تعالیٰ کا عظیم انعام ہے کہ اس نے ان کے خاندان کو اس عظیم اور عالم گیر برکت کے ظہور کے لیے منتخب فرمایا۔ اس سے لازمی نتیجہ کے طور پر دو باتیں نکلتی ہیں: ایک یہ کہ بنی اسمٰعیل پر یہ حق ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے اس عظیم انعام کی قدر کریں اور اس کے شکر گزار ہوں۔ دوسری یہ کہ بنی اسرائیل کے غصہ اور حسد کے علی الرغم اللہ تعالیٰ نے اپنی اس عظیم برکت سے امیوں کو نوازا۔ وہ جس کو چاہے اپنی رحمت کے لیے خاص کرے، اس کی مشیت میں خود اس کی حکمت کے سوا اور کسی کو بھی دخل نہیں ہے۔“ (تدبر قرآن ۲/ ۱۲۲)

[۱۳۹] یعنی وہ پیشین گوئیاں پوری دیانت داری کے ساتھ بیان کر دیں گے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے متعلق ان کے پیغمبروں نے کی تھیں اور جن کے وہ امین بنائے گئے تھے۔

[۱۴۰] یہ قرآن نے دین و شریعت کے معاملے میں ان کی خیانت کا سبب بیان کیا ہے کہ جو لوگ دنیا کی اس متاع حقیر کو ادا کرنے میں لیت و لعل کرتے ہیں، وہ اتنی بڑی امانت کس طرح ادا کریں گے اور دنیا کے سامنے نبی

مَنْ اَوْفٰی بِعَھْدِہٖ وَاتَّقٰی ، فَاِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُتَّقِیْنَ ﴿۷۶﴾

باندھتے ہیں۔ ہاں، کیوں نہیں[۱۴۲]؟ (اللہ کا طریقہ تو یہ ہے کہ) جو اُس کے عہد کو پورا کرے اور پرہیزگار رہے، (وہ اُسے محبوب ہے)، اس لیے کہ اللہ پرہیزگاروں سے محبت کرتا ہے[۱۴۳]۔ ۷۵۔۷۶

امی کی صداقت کی گواہی کس طرح دیں گے؟ تاہم یہ بات بھی قرآن نے اس کے ساتھ واضح کر دی ہے کہ ان میں سے جو لوگ امانت دار ہیں، وہ اس معاملے میں پیچھے نہیں رہیں گے اور جلد یا بدیر آپ کی تصدیق کر کے اسلام کی نعمت سے بہرہ ور ہو جائیں گے۔

[۱۴۱] یہود کا نظریہ تھا کہ تورات میں دوسروں کا مال باطل طریقوں سے کھانے کی جو ممانعت بیان ہوئی ہے، اس کا تعلق غیر قوموں سے نہیں ہے۔ بنی اسمٰعیل کو وہ امی کہتے اور انھی قوموں میں شامل سمجھتے تھے۔ چنانچہ ان کے بارے میں بھی ان کے مولویوں کا فتویٰ یہی تھا کہ ان کا مال ہڑپ کر جانا کوئی عیب کی بات نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں اس کی اجازت دے رکھی ہے۔

[۱۴۲] یعنی کیوں الزام نہیں ہے؟ اللہ کا قانون سب کے لیے یکساں ہے۔ بدعہدی اور خیانت جس کے ساتھ بھی کی جائے، ہر حال میں ممنوع ہے۔ اللہ نے اس کی اجازت کبھی کسی شخص یا قوم کو نہیں دی ہے۔

[۱۴۳] اس جملے میں جواب شرط حذف ہے جسے ہم نے کھول دیا ہے۔ یہود کی جو باتیں اوپر نقل ہوئی ہیں، یہ ان پر استدراک ہے۔ استاذ امام اس کی وضاحت میں لکھتے ہیں:

> ’’... مطلب یہ ہے کہ یہود کا یہ خیال بالکل غلط ہے کہ ان کے لیے خدا کے ہاں کوئی خاص مرتبہ و مقام ہے جس کے سبب سے وہ دوسروں سے بالاتر اور امیوں کے معاملے میں ذمہ داریوں سے بری ہیں۔ اصل یہ ہے کہ اللہ کے ہاں جو مرتبہ و مقام بھی ہے، وہ ان لوگوں کے لیے ہے جو خدا سے باندھے ہوئے عہد کو پورا کریں اور ہر طرح کے حالات میں اس عہد کے تحت قائم کردہ حدود کی نگہداشت کریں۔ جن لوگوں کی روش یہ ہوگی، وہ اللہ کے نزدیک متقی ہیں اور اللہ ایسے ہی متقی بندوں کو دوست رکھتا ہے۔ جو لوگ خدا کے عہد اور اس کے حدود کو توڑنے میں بے باک ہیں اور اس کے باوجود تقویٰ اور محبوب الٰہی ہونے کے مدعی ہیں، وہ محض خیالی پلاؤ پکا رہے ہیں۔‘‘ (تدبر قرآن ۲/ ۱۲۴)

[باقی]

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

معز امجد

قریش کے ابتدائی اہل ایمان کے لیے نبی کریم کی دعا

رُوی أنه قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه و سلم : اللّٰهم أذقت أول قریش نکالاً[2]، فأذق آخرهم نوالاً[3].

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (قریش کے اہل ایمان کے لیے) یوں دعا فرمائی: اے اللہ، تو نے قریش کے ان اولین (اہل ایمان) کو مصائب میں رکھا[1]، مگر اب ان کے بعد والوں کو راحت نصیب فرما[2]۔

ترجمے کے حواشی

۱۔ یعنی ایمان لانے کے نتیجے میں جب ان پر شدید ظلم وستم کیا گیا اور وہ اپنے ہی خاندان اور رشتہ داروں کی طرف سے اپنے گھروں سے بے دخل کر دیے گئے۔

۲۔ بعض روایات کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا مکہ سے ہجرت کے موقع پر کی۔ اس دعا میں اہل ایمان کے لیے یہ بشارت بھی تھی کہ اگرچہ اس موقع پر وہ کفار کی طرف سے ظلم وستم کے نتیجے میں اپنا گھر بار چھوڑنے پر مجبور

ہو گئے ہیں، تاہم جلد ہی ان کے لیے اور ان کی اگلی نسلوں کے لیے یہ مشکلات راحت میں بدل جائیں گی۔

متن کے حواشی

۱۔ بعض اختلافات کے ساتھ یہ روایت حسب ذیل مقامات پر نقل ہوئی ہے:

ترمذی، رقم ۳۹۰۸۔ احمد بن حنبل، رقم ۲۱۷۰۔ ابن ابی شیبہ، رقم ۳۲۳۹۶۔ ابو یعلیٰ، رقم ۲۶۶۲۔

۲۔ احمد بن حنبل، رقم ۲۱۷۰ میں 'اللّٰھم أذقت أول قریش نکالا' (اے اللہ تو نے قریش کے ان اولین اہل ایمان کو مصائب میں رکھا) کے بجائے 'اللّٰھم إنك أذقت أوائل قریش نکالا' (اے اللہ تو نے بے شک قریش کے ان اولین اہل ایمان کو مصائب میں رکھا) کے الفاظ، جبکہ ابن ابی شیبہ، رقم ۳۲۳۹۶ میں 'اللّٰھم کما أذقت أولھم عذابا' (اے اللہ جس طرح تو نے قریش کے ان اولین اہل ایمان کو شدید مصائب میں رکھا) کے الفاظ اور ابو یعلیٰ، رقم ۲۶۶۲ میں 'اللّٰھم إنك أذقت أولھم وبالا' (اے اللہ تو نے بے شک قریش کے ان اولین اہل ایمان کو شدید مشکلات میں رکھا) کے الفاظ روایت ہوئے ہیں۔

۳۔ ابو یعلیٰ، رقم ۲۶۶۲ کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا ہجرت مدینہ کے موقع پر کی۔ ابو یعلیٰ کی یہ روایت اس طرح نقل ہوئی ہے:

لما خرج رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم من مکة قال: أما واللّٰه لأخرج منك وإني لأعلم أنك أحب بلاد اللّٰه إلی وأکرمه علی اللّٰه ولولا أن أھلك أخرجوني ما خرجت. یا بني عبد مناف إن کنتم ولاة ھذا الأمر من بعدی فلا تمنعوا طائفا ببیت اللّٰه ساعة من لیل ولا نھار. ولولا أن تطغی قریش لأخبرتھا مالھا عند اللّٰه. اللّٰھم إنك أذقت أولھم

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مکہ سے روانہ ہوئے تو آپ نے فرمایا: خدا کی قسم (اے مکہ) اگرچہ میں تمھیں چھوڑے جا رہا ہوں، تاہم مجھے معلوم ہے کہ تم میرے لیے (دنیا میں موجود) خدا کے شہروں میں سے سب سے زیادہ محبوب اور قابل احترام ہو۔ اگر تمھارے باشندے مجھے نہ نکالتے تو میں کبھی یہاں سے نہ نکلتا۔ اے بنی عبد مناف اگر تم میرے بعد اس معاملے (یعنی مکہ کی حکمرانی) کے نگران بنائے گئے تو کسی گروہ کو روز و شب کے ایک لمحے کے لیے بھی اللہ کے گھر (میں داخل ہونے) سے نہ روکنا۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

وبالا فأذق آخرهم نوالا.

اگر قریش نے سرکشی نہ کی ہوتی تو میں انھیں بتاتا کہ ان کے لیے خدا کے ہاں کیا (اجر) جمع تھا۔ اے پروردگار تو نے قریش کے اولین (اہل ایمان) کو مصائب میں رکھا، اب ان کے بعد والوں کو راحت نصیب فرما۔‘‘

تخریج: محمد اسلم نجمی

کوکب شہزاد

ترجمہ وترتیب: اظہار احمد

---

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

طالب محسن

اہل کفر سے قتال

عن أبی هريرة رضی اللّٰه عنه قال لما توفی رسول اللّٰه صلی اللّٰه عليه وسلم واستخلف ابوبکر رضی اللّٰه عنه بعده وکفر من کفر من العرب قال عمر بن الخطاب رضی اللّٰه عنه لأبی بکر رضی اللّٰه عنه کيف نقاتل الناس وقد قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه عليه وسلم امرت أن أقاتل الناس حتی يقولوا لا اله الا اللّٰه فمن قال لا اله الا اللّٰه فقد عصم منی ماله ونفسه الا بحقه وحسابه علی اللّٰه . فقال ابو بکر رضی اللّٰه عنه واللّٰه، لأقاتلن من فرق بين الصلاة والزکاة. فإن الزکاة حق المال. واللّٰه لو منعونی عقالا کانوا يؤدونه الی رسول اللّٰه صلی اللّٰه عليه وسلم لقاتلتهم علی منعه . قال عمر بن الخطاب رضی اللّٰه عنه فواللّٰه ما هو الا أن رأيت اللّٰه عزوجل قد شرح صدر أبی بکر رضی اللّٰه عنه القتال . فعرفت أنه الحق.

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

’’حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی اور ابوبکر رضی اللہ عنہ آپ کے بعد آپ کے خلیفہ ہوئے اور انھوں نے کفر اختیار کیا جنھوں نے کفر اختیار کیا تھا تو عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کہا: ہم ان لوگوں سے کیسے قتال کریں جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیان کر چکے ہیں: مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں ان لوگوں سے اس وقت تک قتال کروں جب تک یہ لا الٰہ الا اللہ نہ کہہ دیں۔ چنانچہ جس نے لا الٰہ الا اللہ کہہ دیا اس نے مجھ سے اپنا مال اور اپنی جان بچالی، الا یہ کہ اس پر کوئی حق قائم ہو جائے۔ اور ان کا حساب اللہ پر ہے۔ یہ سن کر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: بخدا، میں ان سے ضرور قتال کروں گا جو نماز اور زکوٰۃ میں فرق کرتے ہیں۔ کیونکہ زکوٰۃ مال کا حق ہے۔ اللہ کی قسم، اگر انھوں نے ایک رسی بھی روکی جو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیتے تھے تو میں اس روکنے پر ان سے لڑوں گا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: بخدا یہ ایسے شخص ہیں جن کا سینہ اللہ نے قتال کے لیے کھول دیا ہے۔ میں نے جان لیا کہ یہی حق ہے۔‘‘

عن سعيد ابن مسيب أن أبا هريرة أخبره أن رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه و سلم قال: أمرت أن أقاتل الناس حتى يقول: لا إله إلا اللّٰه. فمن قال: لا إله إلا اللّٰه عصم منى ماله و نفسه إلا بحقه. و حسابه على اللّٰه.

’’حضرت سعید ابن مسیّب بیان کرتے ہیں کہ انھیں ابو ہریرہ نے بتایا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا: مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں ان لوگوں سے اس وقت تک قتال کروں جب تک یہ لا الٰہ الا اللہ نہ کہہ دیں۔ چنانچہ جس نے لا الٰہ الا اللہ کہہ دیا اس نے مجھ سے اپنا مال اور اپنی جان بچالی، الا یہ کہ اس پر کوئی حق قائم ہو جائے۔ اور اس کا حساب اللہ پر ہے۔‘‘

عن أبى هريرة عن رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه و سلم قال: أمرت أن أقاتل الناس حتى يشهدوا أن لا إله إلا اللّٰه و يؤمنوا بى و بما جئت به.

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

فـإذا فـعـلوا ذلك عصموا منى دمائهم واموالهم إلا بحقها . وحسابهم على اللّٰه.

’’حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں ان لوگوں سے اس وقت تک قتال کروں جب تک یہ گواہی نہ دیں کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور مجھ پر اور اس چیز پر ایمان نہ لے آئیں جو میں لے کر آیا ہوں۔ پھر جب وہ یہ کر لیں گے تو مجھ سے اپنی جانیں اور اپنے مال بچا لیں گے، الا یہ کہ ان پر کوئی حق قائم ہو جائے۔ اور ان کا حساب اللہ پر ہے۔‘‘

عـن جـابر رضى اللّٰه عنه قال: قال رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم: أمرت أن أقاتل الناس حتى يقولوا: لا إله إلا اللّٰه .فإذا قالوا: لا إله إلا اللّٰه عـصـموا منى دمائهم وأموالهم الا بحقها. وحسابهم على اللّٰه . ثم قرأ انما أنت مذكر لست عليهم بمسيطر.

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

’’حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں ان لوگوں سے قتال کروں یہاں تک کہ وہ لا الٰہ الا اللہ کہہ دیں۔ پھر جب وہ لا الٰہ الا اللہ کہہ دیں گے تو مجھ سے اپنی جانیں اور اپنے مال بچا لیں گے، الا یہ کہ ان پر کوئی حق قائم ہو جائے۔ اور ان کا حساب اللہ پر ہے۔ پھر آپ نے یہ آیت تلاوت کی: ’انـمـا أنـت مـذكـر لست عليهم بمسيطر‘، تم تو بس یاددہانی کرنے والے ہو، ان پر داروغہ نہیں ہو۔‘‘

عـن عبـد اللّٰه بـن عـمـر قـال: قـال رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم أمرت أن أقاتل الناس حتى يشهدوا أن لا إله إلا اللّٰه وأن محمدا رسول اللّٰه ويقيموا الصلاة ويؤتوا الزكاة. فإذا فعلوا ذلك عصموا منى دمائهم

وأموالهم إلا بحقها وحسابهم على الله.

''حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں ان لوگوں سے اس وقت تک قتال کروں جب تک یہ اس بات کی گواہی نہ دیں کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور یہ کہ محمد اللہ کے رسول ہیں اور نماز کا اہتمام کرنے لگیں اور زکوٰۃ ادا کرنے لگیں۔ جب وہ یہ کرلیں گے تو مجھ سے اپنی جانیں اور اموال بچالیں گے الا یہ کہ کوئی حق ان پر قائم ہو جائے۔ اور ان کا حساب اللہ پر ہے۔''

لغوی مباحث

کفر من کفر من العرب: اہل عرب میں سے جس نے کفر اختیار کیا اس نے کفر اختیار کیا۔ یہ عربی زبان میں ایجاز کا اسلوب ہے۔ اس میں اس واقعے کی طرف اشارہ ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد اہل عرب کے قبائل کے دین سے انحراف کی صورت میں پیش آیا تھا۔ مختصراً یہ کہ کچھ لوگ بت پرستی کی طرف پلٹ گئے تھے۔ کچھ نے نئے مدعیان نبوت کی پیروی اختیار کر لی تھی اور کچھ لوگوں نے باقی دین کو مانتے ہوئے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ یہاں یہ بات بھی واضح رہے کہ یہ معاملہ عوامی نہیں تھا۔ قبائل کے سرداروں نے اپنے عوام کو زکوٰۃ دینے سے روک دیا تھا۔ مثلاً بنو یربوع نے زکوٰۃ جمع کر رکھی تھی، لیکن ان کے سردار نے مرکز بھجوانے سے روک دیا۔ اس سارے معاملے کی طرف حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے ایک مختصر اسلوب سے اشارہ کر دیا ہے۔

أمرت: مجہول کا صیغہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کی نسبت سے بالکل واضح ہے کہ امر دینے والا کون ہے۔ امر کا فعل اردو کے لفظ کہنا کی طرح محض مشورے اور حکم کے معنی میں آتا ہے۔ یہاں یہ دوسرے معنی میں آیا ہے۔

یقیموا الصلوٰۃ: اقامت صلوٰۃ کے ایک معنی تو تعدیل ارکان اور نماز کے آداب و واجبات کو کما حقہ ادا کرنے کے ہیں۔ اس کی دلیل اس کے استعمال 'اقام العود' (اس نے لکڑی کو سیدھا کر دیا) میں ہے۔ دوسرے معنی مداومت کے ہیں۔ اس کی دلیل 'قامت السوق' میں ہے۔ یہ اس وقت بولا جاتا ہے جب بازار میں خرید و فروخت کی گہما گہمی ہو۔ تیسرے معنی سرگرمی اور انہماک کے ہیں اور اس کی دلیل 'قامت الحرب علی ساقها' میں

ہے۔ یہ اس وقت بولا جاتا ہے جب جنگ میں لڑائی شدت سے ہو رہی ہو۔ قرآن مجید میں جس طرح یہ لفظ نماز کے ساتھ آیا ہے اسی طرح دین کے ساتھ بھی آیا ہے۔ یہاں اس کے سوا کوئی معنی نہیں ہو سکتے کہ دین کو پوری طرح اختیار کر لیا جائے۔ نماز کے ساتھ بھی اس کے معنی یہی ہیں اور ظاہر ہے اس میں تعدیل ارکان، آداب وواجبات کا لحاظ، مداومت اور سرگرمی سب چیزیں شامل ہیں۔

دم: خون کے معنی میں یہ ایک معروف لفظ ہے۔ البتہ اس کے اشتقاق کے بارے میں اختلاف ہے۔ 'دماء' کے طریقے کی جمع 'دمی' سے بھی بن سکتی ہے اور 'دمو' سے بھی۔ جیسے 'ظبی' کی جمع 'ظباء' آتی ہے اور 'دلو' کی جمع 'دلاء' آتی ہے۔ سیبویہ اور مبرد دونوں کے نزدیک اس کا مادہ 'دمی' ہی ہے۔

عقالا، عناقا: عقال اس رسی کو کہتے ہیں جو اونٹ کو باندھنے کے کام آتی ہے۔ ایک دوسری روایت میں عناق کا لفظ بھی آیا ہے۔ عناق بکری کے اس بچے کو کہتے ہیں جس کی عمر سال سے کم ہو۔ اگرچہ دونوں لفظ اس جملے میں درست قرار دیے جا سکتے ہیں، لیکن جس غرض سے ابوبکر رضی اللہ عنہ نے یہ جملہ بولا ہے اس کے اعتبار سے عقال ہی موزوں ہے۔ یعنی دوسرے الفاظ میں حضرت ابوبکر یہ کہنا چاہتے ہیں کہ وہ زکوٰۃ کی مد میں آنے والا ایک پیسہ بھی چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ عقال کا لفظ عام زکوٰۃ کے معنی میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ لیکن ہمارے نزدیک اس سیاق وسباق میں یہ اس معنی میں بھی نہیں آیا۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

معنی

پہلی روایت میں حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ایک مکالمے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک قول بطور دلیل زیر بحث آیا ہے۔ اس کے بعد مسلم رحمہ اللہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول کے مختلف متون نقل کیے ہیں۔ اس مکالمے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس معاملے میں تردد تھا کہ مانعین زکوٰۃ کے خلاف قتال درست ہے یا نہیں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی رائے یہ تھی کہ مانعین زکوٰۃ کے خلاف جنگ کی جائے گی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے یہ تھی کہ وہ لوگ کلمۂ توحید پڑھ چکے ہیں ان کے خلاف ہتھیار نہیں اٹھانے چاہییں۔ اس کے لیے انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ارشاد بھی بطور دلیل پیش کیا۔ لیکن حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے یہ کہا کہ وہ نماز اور زکوٰۃ میں فرق نہیں کریں گے۔ حضرت ابوبکر کی یہ بات سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ مطمئن ہو گئے۔ ظاہر ہے یہ مکالمہ نامکمل ہے۔ یہ سوال پوری تفصیل سے زیر بحث آیا ہو گا کہ کسی مسلمان کے خلاف ہتھیار

اٹھانے کے لیے کیا شرائط ہیں اور مانعین زکوٰۃ کے خلاف یہ شرائط پوری ہوئی ہیں یا نہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے استدلال ہی سے مطمئن ہوئے ہوں گے۔ شارحین کی یہ بات کہ حضرت عمر کے سامنے وہ روایت نہیں تھی جس میں ایمان کے علاوہ نماز اور زکوٰۃ کا بھی ذکر ہے، اس لیے انھوں نے اختلاف کیا محل نظر ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اہل عرب کے ایمان نہ لانے کی صورت میں انھیں مار دینے کا حکم سورۂ توبہ میں دیا گیا ہے۔ اور وہیں یہ بھی واضح کر دیا گیا ہے کہ ان کے لیے موت سے بچنے کی ایک ہی صورت ہے کہ وہ ایمان لائیں، نماز اور زکوٰۃ ادا کرنے لگیں۔ ظاہر ہے سورۂ توبہ کی یہ آیات دونوں اصحاب کے مابین زیر بحث آئی ہوں گی اور انھی کے تحت یہ کارروائی کی گئی ہوگی۔ یہ بات ان جلیل القدر ہستیوں سے کیسے مخفی رہ سکتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کہ انھیں اہل کفر کے ساتھ جنگ کا حکم دیا گیا ہے قرآن مجید کی کس آیت کے تحت ہے۔ شارحین کی یہ بات بھی درست نہیں ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنے قیاس کو روایت کے مقابلے میں پیش کیا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے سامنے قرآن مجید کا صریح حکم تھا اور انھوں نے یقیناً یہی فرمایا ہوگا کہ آپ کا یہ ارشاد قرآن مجید کے اسی حکم کا بیان ہے۔ لہٰذا میں منشاے خداوندی کے تحت ایمان، نماز اور زکوٰۃ میں سے کسی فرق کو روا نہیں رکھوں گا۔ یہی بات حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اطمینان کا باعث بنی ہوگی۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

شیخین کے مکالمے والی اس روایت میں اگرچہ نماز اور زکوٰۃ کا ذکر نہیں ہے، لیکن امام مسلم نے اس کے دوسرے متون جمع کر کے واضح کر دیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے وہی بات فرمائی ہے جس کا حکم انھیں سورۂ توبہ میں دیا تھا۔ سورۂ توبہ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

فَإِذَا انسَلَخَ الأَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ حَيْثُ وَجَدْتُمُوهُمْ وَخُذُوهُمْ وَاحْصُرُوهُمْ وَاقْعُدُوا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ فَإِنْ تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلاَةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ فَخَلُّوا سَبِيلَهُمْ إِنَّ اللّٰهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ. (۹:۵)

’’جب حرام مہینے گزر جائیں تو ان مشرکوں کو جہاں پاؤ، قتل کرو، انھیں پکڑو، انھیں گھیرو اور ہر گھات میں ان کی تاک لگاؤ۔ ہاں، اگر یہ توبہ کر لیں اور نماز کا اہتمام کریں اور زکوٰۃ ادا کریں تو ان کی راہ چھوڑ دو۔ بے شک، اللہ بخشنے والا ہے، وہ سراسر رحمت ہے۔‘‘

اس آیت کے موقع نزول کو واضح کرتے ہوئے استاذ محترم نے لکھا ہے:

’’مشرکین عرب ـــــ جب ـــــ مغلوب ہو گئے تو سورۂ توبہ میں اعلان کر دیا گیا کہ اب ان کے ساتھ آیندہ کوئی معاہدہ نہیں ہوگا اور ان کے لیے چار مہینے کی مہلت ہے، اس کے بعد رسوائی کا عذاب ان پر مسلط ہو جائے گا جس سے نکلنے کی کوئی راہ وہ اس دنیا میں نہ پا سکیں گے۔ چنانچہ مکہ فتح ہوا اور جس طرح ان کے بعض معاندین بدر اور احد کے قیدیوں میں سے قتل

کیے گئے تھے، اسی طرح اس موقع پر بھی قتل کر دیے گئے۔ اس سے پہلے سورۂ توبہ کا یہ حکم ان کے بارے میں نازل ہو چکا تھا کہ حج اکبر کے موقع پر اس بات کا اعلان کر دیا جائے کہ حرام مہینے گزر جانے کے بعد مسلمان ان مشرکین کو جہاں پائیں گے، قتل کر دیں گے، الاّ یہ کہ وہ ایمان لائیں، نماز کا اہتمام کریں اور زکوٰۃ ادا کریں۔ اس سے مستثنیٰ صرف وہ لوگ قرار دیے گئے جن کے ساتھ متعین مدت کے معاہدات تھے۔ ان کے بارے میں ہدایت کی گئی کہ اگر وہ کوئی خلاف ورزی نہیں کرتے تو ان معاہدات کی مدت تک انھیں پورا کیا جائے گا۔ اس کے صاف معنی یہ تھے کہ مدت پوری ہو جانے کے بعد یہ معاہدین بھی اسی انجام کو پہنچیں گے جو جزیرہ نمائے عرب کے تمام مشرکین کے لیے مقدر کر دیا گیا ہے۔'' (میزان ۲۶۸)

اس تفصیل سے واضح ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے کیا مراد ہے۔ اس روایت کے ایک متن میں الناس کی جگہ المشرکین کا لفظ آیا ہے۔ اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے الناس کا لفظ ہی بولا ہو تب بھی اس دوسری روایت سے واضح ہے کہ اس زمانے میں اس سے مشرکین ہی سمجھے گئے ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف موقعوں پر جب ان آیات کے حکم کا حوالہ دیا ہو تو کبھی مشرکین اور کبھی الناس کا لفظ بولا ہو۔ صورت کچھ بھی ہو یہ بات متعین ہے کہ آپ اس روایت میں وہ بات بیان فرما رہے ہیں جو سورۂ توبہ میں آئی ہے۔ چند شارحین کو چھوڑ کر عام طور پر اس روایت کو سورۂ توبہ کے اس حکم کے ساتھ جوڑ کر نہیں دیکھا گیا۔ ہمارے نزدیک حدیث کو سمجھنے کا یہ طریقہ محل نظر ہے۔ قرآن مجید میں جب ایک بات بیان ہوگئی ہو تو حدیث کو اس کی روشنی میں سمجھنا چاہیے۔ اس صورت میں اس کا اندیشہ بہت کم ہو جاتا ہے کہ ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی ارشاد کا اصل محل نہ سمجھ سکیں۔

اس تفصیل سے چند باتیں متعین ہو جاتی ہیں:

ایک یہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا تعلق آپ کی قوم سے تھا۔ سورۂ توبہ کی محولہ آیت کے سیاق و سباق سے بالکل واضح ہے کہ حکم بنی اسماعیل کے مشرکین سے متعلق ہے۔

دوسری یہ کہ ان مشرکین کے لیے زندگی کی ضمانت صرف ایک صورت میں تھی کہ یہ ایمان لائیں اور نماز اور زکوٰۃ ادا کرنے لگیں۔ اس سلسلے میں کسی ایک چیز کے بارے میں کمی کرنے کا اختیار کسی کو نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اس معاملے میں کوئی کمی کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔

تیسری یہ کہ قرآن مجید کا یہ حکم اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ بیان آیندہ نسلوں کے لیے حکم جہاد کا ماخذ نہیں ہے۔ استاد محترم نے اپنی کتاب ''میزان'' میں اس حقیقت کو واضح کرتے ہوئے لکھا ہے:

''اس سے واضح ہے کہ یہ محض قتال نہ تھا، بلکہ اللہ تعالیٰ کا عذاب تھا جو اتمام حجت کے بعد سنت الٰہی کے عین مطابق اور ایک فیصلۂ خداوندی کی حیثیت سے پہلے عرب کے مشرکین اور یہود و نصاریٰ پر اور اس کے بعد عرب سے باہر کی اقوام پر نازل کیا

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

گیا۔لٰہذا یہ بالکل قطعی ہے کہ منکرین حق کے خلاف جنگ اور اس کے نتیجے میں مفتوحین پر جزیہ عائد کر کے انھیں محکوم اور زیردست بنا کر رکھنے کا حق اس کے بعد ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا ہے۔قیامت تک کوئی شخص اب نہ دنیا کی کسی قوم پر اس مقصد سے حملہ کر سکتا ہے اور نہ کسی مفتوح کو محکوم بنا کر اس پر جزیہ عائد کرنے کی جسارت کر سکتا ہے۔مسلمانوں کے لیے قتال کی ایک ہی صورت باقی رہ گئی ہے، اور وہ ظلم و عدوان کے خلاف جنگ ہے۔اللہ کی راہ میں قتال اب یہی ہے۔اس کے سوا کسی مقصد کے لیے بھی دین کے نام پر جنگ نہیں کی جا سکتی۔''(۲۷۰)

چوتھی بات یہ کہ جان سے مار دینے کی یہ ہدایت صرف مشرکین سے متعلق تھی۔یہود و نصاریٰ کو اپنے دین پر قائم رہنے کی اجازت تھی۔ان کے لیے سزا محکومی اور جزیہ تھی۔

ان نکات کے متعین ہو جانے سے وہ بحثیں غیر اہم ہو جاتی ہیں جو بعض شارحین نے ان الفاظ کو عموم پر لے کر کی ہیں۔ہمارے نزدیک انھی شارحین کا نقطۂ نظر درست ہے جو اس روایت کو سورۂ توبہ کے حکم کا بیان سمجھتے ہیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ذمہ داری کو بیان کرتے ہوئے آخر میں دو باتیں مزید واضح کی ہیں۔ایک یہ کہ جو لوگ یہ تین شرطیں پوری کر دیں گے، وہ ان ذمہ داریوں سے عہدہ برآ نہیں ہو جائیں گے جو ان پر قصاص و دیت وغیرہ کی صورت میں عائد ہوں گی۔جو مسلمان جرائم میں ماخوذ ہو گا، اسے اس کے جرم کے مطابق سزا دی جائے گی۔اس طرح آپ نے واضح کر دیا کہ اس قانون کا مطلب یہ ہے کہ حکومت اپنی جانب سے غیر مشروط طور پر زکوٰۃ اور نماز کے سوا کسی چیز کا مطالبہ نہیں کر سکتی۔دوسری یہ کہ ہمارا یہ معاملہ ظاہر سے متعلق ہے۔اس سے کسی کو یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ وہ منافقت اختیار کر کے اگر کوئی معاملہ کرتا ہے تو وہ دنیا کی طرح آخرت میں بھی اپنے آپ کو بچا لے گا۔ہماری ذمہ داری تو پوری ہو جائے گی، جب ہم اس کے ساتھ اس کے ظاہر کے مطابق معاملہ کر لیں گے، لیکن اسے اس معاملے میں باخبر رہنا چاہیے کہ آخرت کا معاملہ اللہ پر ہے۔اس کا اسلامی حکومت کے کسی فیصلے سے یہ تعلق نہیں کہ وہ محض اس بنا پر چھوڑ دیا جائے گا کہ ہماری حکومت نے اسے چھوڑ دیا ہے۔

متون

اس روایت کے اہم متون مسلم میں آ گئے ہیں۔ان میں دو فرق تو بہت نمایاں ہیں۔ایک یہ کہ حضرت عمر اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہما نے جس روایت کو بناے استدلال بنایا ہے، اس میں صرف ایمان کا ذکر ہے اور اس روایت کے باقی متون میں ایمان کے ساتھ نماز اور زکوٰۃ کا بھی ذکر ہے۔اس سے واضح ہے کہ مکمل بات یہی ہے۔حضرت عمر نے جس بات کا حوالہ دیا ہے، وہ اسی کا ایک مختصر بیان معلوم ہوتا ہے۔جب قرآن مجید میں ایک بات بیان ہو گئی

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

ہے تو اس کے بعد ہم بآسانی طے کر سکتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری بات کیا تھی۔ اس سلسلے کی ایک روایت وہ بھی ہے جس میں یہی بات بالکل دوسرے الفاظ میں بیان ہوئی ہے۔ بخاری میں ہے:

عن أنس بن مالك رضى الله عنه قال قال رسول الله صلى الله عليه و سلم أمرت أن أقاتل الناس حتى يقولوا لا اله الا الله فاذا قالوها وصلوا صلاتنا واستقبلوا قبلتنا وذبحوا ذبيحتنا فقد حرمت علينا دماؤهم وأموالهم إلا بحقها وحسابهم على الله. (رقم ۳۸۵)

''حضرت انس بن مالک رضی اللہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں ان لوگوں سے جنگ کروں یہاں تک کہ یہ لا الٰہ الا اللہ کا اقرار کر لیں۔ پھر جب یہ اقرار کر لیں اور ہماری نمازیں پڑھنے لگیں، ہمارے قبلے کی طرف رخ کرنے لگیں اور ہمارے طریقے پر جانور ذبح کرنے لگیں تو ہم پر ان کا خون اور مال حرام ہو گیا۔ الا یہ کہ ان پر کوئی حق قائم ہو جائے اور ان کا حساب اللہ پر ہے۔''

روایت کا یہ متن اس بات کو بالکل واضح کر دیتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سے زیادہ موقعوں پر سورۂ توبہ میں عائد شدہ ذمہ داری کا ذکر کیا تھا۔ کبھی محض اس کی طرف حوالہ کا جملہ بول کر، کبھی اسے من وعن بیان کر کے اور کبھی اس طرح کہ ماننے والے پر وہ علامتیں ظاہر ہو گئی ہیں کہ وہ اسلامی سوسائٹی کا پوری طرح حصہ بن گیا ہے۔

ان کے علاوہ اس روایت کے دوسرے متون میں لفظی فرق بھی ہیں۔ مثلاً مسلم میں جو بات 'کفر من کفر' کے اسلوب میں آئی وہ ایک دوسری روایت میں 'ارتدت العرب' کے اسلوب میں آئی ہے۔ اسی طرح 'أقاتل الناس' کے بجائے 'أقاتل المشركين' بھی آیا ہے۔ کسی روایت میں 'حتى يقولوا لا اله الا الله' کسی میں 'حتى يشهدوا ان لا اله الا الله ويومنوا بى وبما جئت به' اور کسی میں 'حتى يشهدوا أن لا اله الا الله و أن محمدا رسول الله' آیا ہے۔ ایک روایت میں یہ بات کہ ''ان کا مال اور جان محفوظ ہو گئے'' ایک دوسرے اسلوب میں آئی ہے۔ آپ نے فرمایا: 'لهم ما للمسلمين وعليهم ما عليهم'۔ بعض روایات میں 'عقال' کی جگہ 'عناق' کا لفظ آیا ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی لفظی فرق ہیں۔ اہم فرق ہم نے بیان کر دیے ہیں۔

کتابیات

بخاری، رقم ۲۵، ۳۸۵، ۱۳۳۵، ۲۷۸۶، ۶۵۲۶، ۶۸۵۵۔ مسلم، رقم ۲۱، ۲۲۔ ابوداؤد، رقم ۱۵۵۶، ۱۵۵۷، ۲۶۴۰، ۲۶۴۱، ۲۶۴۲۔ ترمذی، رقم ۲۶۰۶، ۲۶۰۷، ۲۶۰۸، ۳۳۴۱۔ نسائی، رقم ۲۴۴۳، ۳۰۹۰ تا ۳۰۹۵، ۳۹۶۶ تا

۳۹۸۳، ۵۰۰۳۔ ابن ماجہ، رقم ۱۷۲۷، ۱۳۴۵، ۱۷۶۰، ۳۹۲۷، ۳۹۲۸۔ دارمی، رقم ۲۴۴۶۔ ابن حنبل، رقم ۶۷، ۱۱۷، ۲۳۹، ۳۳۵، ۸۱۴۸، ۸۵۲۵، ۸۸۹۱، ۹۴۶۹، ۹۶۵۹، ۱۰۱۶۱، ۱۰۱۶۲، ۱۰۲۵۹، ۱۰۵۲۵، ۱۰۸۳۴، ۱۰۸۵۲، ۱۳۰۷۸، ۱۴۱۷۴، ۱۴۲۴۷، ۱۴۶۰۰، ۱۴۶۹۱، ۱۵۲۷۸، ۱۶۲۰۵، ۱۶۲۱۱، ۱۹۰۴۳۔ ابن حبان، رقم ۱۷۴، ۱۷۵، ۲۱۶ تا ۲۲۰، ۵۸۹۵۔ ابن خزیمہ، رقم ۲۲۴۷، ۲۲۴۸۔ مستدرک، رقم ۱۴۲۷، ۱۴۲۸، ۳۹۲۶۔ صحیفہ ہمام، رقم ۵۰۔ ابویعلیٰ، رقم ۶۸، ۲۲۸۲، ۶۱۳۴۔

---

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

ساجد حمید

نماز کے اوقات

عبداللہ بن رافع اور ابو ہریرہ کی گفتگو

[۹] وحدثنی عن مالك عن يزيد بن زياد عن عبد اللّٰه بن رافع مولى ام سلمة زوج النبی صلى اللّٰه عليه وسلم: انه سأل ابا هريرة عن وقت الصلاة. فقال: ابو هريرة: انا اخبرك:

صَلِّ الظُّهرَ اِذَا كَانَ ظِلُّكَ مِثلَكَ، وَالعَصرَ اِذَا كَانَ ظِلُّكَ مِثلَيكَ، وَالمَغرِبَ اِذَا غَرَبَتِ الشَّمسُ، وَالعِشَاءَ مَا بَينَكَ وَبَينَ ثُلُثُ اللَّيلِ، وَصَلِّ الصُّبحَ بِغَبَشٍ يَعنِى الغَلَسَ.

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجۂ محترمہ ام سلمیٰ کے آزاد کردہ غلام عبداللہ بن رافع نے ابو ہریرہ سے نمازوں کے اوقات کے بارے میں پوچھا، تو انھوں نے کہا میں تمھیں بتائے دیتا ہوں:

''ظہر اس وقت پڑھو، جب تمھارا سایہ تمھاری قامت کے برابر ہو، اور عصر اس وقت پڑھو جب تمھارا سایہ تمھاری قامت سے دگنا ہو۔ مغرب سورج ڈوبنے پر پڑھو، اور عشا اس کا وقت ہونے سے لے کر ایک تہائی رات کے درمیان میں پڑھو۔ اور صبح کی نماز تاریکی میں پڑھو۔''

شرح

مفہوم و مدعا

یہ روایت ابو ہریرہ کا اثر ہے۔ اس میں وہی اوقات بتائے گئے ہیں۔ جو پچھلی تمام روایتوں میں بتائے جا رہے ہیں۔ البتہ ظہر اور عصر کے وقت کے بیان کے لیے انھوں نے سایے کے مثل اور مثلین ہونے کا اسلوب استعمال کیا ہے۔ یہ اسلوب امامت جبریل والی روایتوں میں بھی اختیار کیا گیا ہے۔

جواب کی نوعیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ عبداللہ بن رافع نے پسندیدہ اوقات کے خاتمہ سے متعلق سوال کیے تھے۔ یہی رائے صاحب المنتقی شرح موطا امام مالک نے اختیار کی ہے۔ البتہ انھوں نے پسندیدہ اور غیر پسندیدہ اوقات کا امتیاز نہیں کیا۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

لغوی مسائل

'اذا کان ظلك مثلك، اذا کان ظلك مثليك' میں 'مثل' کا مضاف الیہ حذف ہے۔ مراد ہے 'اذا کان ظلك مثل قامتك' اور اسی طرح دوسرے جملے میں ہے۔ ہم نے ترجمہ میں اسے بیان کر دیا ہے۔

درایت

اس روایت میں ام سلمٰی رضی اللہ عنہا کے غلام نے ابو ہریرہ سے وقت پوچھا ہے۔ یہ بات اچنبھے کی ہے اس لیے کہ روایت تو وہ ابو ہریرہ سے کر سکتے ہیں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجۂ محترمہ ام سلمٰی کے مولیٰ ہوتے ہوئے، مدینہ میں رہتے ہوئے، جہاں شب و روز نماز پڑھی جا رہی ہے انھیں سوال پوچھنے کی حاجت کیوں پیش آئی؟ اس کی یقیناً کوئی وجہ ہوگی، جو روایت میں موجود نہیں ہے اور نہ کوئی قرینہ ہی ایسا ہے کہ جس سے ہم اس سبب تک پہنچ سکیں۔

البتہ ابو ہریرہ کے جواب کی بنیاد پر یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ انھیں بتائے گئے پسندیدہ اوقات میں اواخر کے بارے میں کوئی اشتباہ ہوگا، جسے انھوں نے ابو ہریرہ سے پوچھ کر دور کیا ہو۔

دیگر طرق

ایک طریقے میں عشا کے وقت کو بتانے کے بعد ابو ہریرہ کے یہ الفاظ بھی وارد ہوئے ہیں:

...فان نمت الی نصف اللیل فلا نامت عیناك... (مصنف عبدالرزاق، رقم ۲۰۴۱)

''... تو اگر تم آدھی رات تک سوتے رہے تو اللہ کرے تیری آنکھ نہ سوئے...''

یہ الفاظ وہی ہیں جو سیدنا عمر نے بھی اپنے خط میں لکھے تھے۔ ممکن ہے دونوں بزرگوں نے ایک ہی اسلوب اختیار کیا ہو، یا راویوں نے التباس کر دیا ہو۔

عصر اور مغرب کا درمیانی وقفہ

[۱۰] وحدثنی عن مالك عن اسحاق بن عبد اللّٰه بن ابی طلحة عن انس بن مالك انه قال:

كُنَّا نُصَلِّی الْعَصْرَ ثُمَّ یَخْرُجُ الاِنْسَانُ اِلَی بَنِیُ عَمْرِو بْنِ عَوْفٍ فَیَجِدُهُمْ یُصَلُّوْنَ الْعَصْرَ.

انس بن مالک کہتے ہیں کہ

''ہم عصر پڑھتے پھر ہم میں سے کوئی آدمی بنو عمرو بن عوف کے مساکن کی طرف جاتا، وہاں پہنچتا تو دیکھتا کہ وہ عصر پڑھ رہے ہوتے تھے۔''

[۱۱] وحدثنی عن مالك عن ابن شهاب عن انس بن مالك انه قال:

كُنَّا نُصَلِّی الْعَصْرَ ثُمَّ یَذْهَبُ الذَّاهِبُ اِلَی قُبَاءٍ فَیَاْتِیهِمْ وَالشَّمْسُ مُرْتَفِعَةٌ.

انس بن مالک کہتے ہیں:

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

''ہم عصر پڑھتے اور کوئی قبا جانے والا قبا جاتا تو جب وہاں پہنچتا تو سورج ابھی بلند ہوتا۔''

شرح

مفہوم و مدعا

یہ دونوں روایتیں بتاتی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم عصر کی نماز اول وقت ہی میں ادا کر لیتے تھے۔ اور اتنا وقت ہوتا تھا کہ ایک نمازی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھ کر نکلتا تو، وہ بنوعمرو بن عوف کے علاقے میں آ کر دیکھتا کہ وہ ابھی نماز پڑھ رہے ہوتے تھے۔ مدینہ سے بنوعمرو کے اس دیار کا فاصلہ شارحین نے دو میل بتایا ہے۔ (شرح الزرقانی ۱:۲۴) اسی طرح دوسری روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آدمی قبا پہنچتا تو سورج ابھی روشن ہوتا۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ دور نبوی ہی میں عصر کی نماز کا معمول مختلف مقامات پر مختلف تھا جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھاتے تھے، تو مسلمانوں کی دوسری بستیوں میں نماز اس کے بعد ہوتی تھی۔ بنوعمرو کا دیار انھی نواحی بستیوں میں سے ایک بستی ہے۔ یہ مدینہ سے تقریباً تین میل کے فاصلہ پر ہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

درایت

قرآن و سنت سے تعلق

سنت میں متعین کردہ وقت میں نماز پڑھنے کے ضمن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اسوہ قائم کیا ہے کہ اس کے اول وقت میں نماز پڑھی جائے الا یہ کہ اس میں کوئی مانع ہو۔ اس روایت میں عصر کے بارے میں معلوم ہوتا ہے کہ آپ اسے بالعموم بہت جلدی ادا کر لیتے تھے۔ پچھلی روایت میں ہم عصر کی تعجیل میں پیش نظر مسائل پر گفتگو کر چکے ہیں۔

احادیث باب پر نظر

یہ روایت انس بن مالک کی ہے اور اس میں یہ واضح نہیں ہے کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کی بات کر رہے ہیں یا بعد کے زمانے کی۔ لیکن چونکہ یہ ایک صحابی ہیں اس لیے یہ غالب امکان ہے کہ ان کی یہ روایت دور نبوی ہی سے متعلق ہوگی اور کئی روایات، جو مدینہ سے عصر پڑھ کر اس کے نواحی علاقوں میں جانے کے مضمون کی حامل

ہیں، ان میں سے بعض میں یہ ذکر موجود ہے کہ ایسا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ہوتا تھا۔ مثلاً انس بن مالک ہی کی روایت ہے:

عن انس بن مالك قال: كان رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم يصلى العصر والشمس مرتفعة حية فيذهب الذاهب الى العوالى فياتيهم والشمس مرتفعة (وبعض العوالى من المدينة على اربعة اميال او نحوه). (بخاری، رقم ۵۲۵)

''حضرت انس بن مالک سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم عصر پڑھایا کرتے اور سورج ابھی بلند اور روشن ہوتا، چنانچہ جانے والا مدینہ کی نواحی بستیوں میں جاتا اور سورج ابھی اونچا ہی ہوتا۔ (مدینہ کی یہ نواحی بستیاں تین یا چار میل کے فاصلے پر تھیں)۔''

یہ مضمون بہت سی روایتوں میں بیان ہوا ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ امامت جبریل والی روایت میں جو وقت بیان کیا گیا ہے، صحابہ اس کے دوران میں کسی بھی وقت نماز ادا کر لیتے تھے۔ اسی لیے یہ ممکن تھا کہ وہ مدینہ سے نماز پڑھ کر نکلتے، اور دو تین میل چل کر کسی نواحی علاقے میں پہنچتے تو تب بھی انھیں عصر پڑھتے ہوئے پاتے۔ ظاہر ہے یہ تبھی ممکن تھا جب وہ مسجد نبوی کے وقت سے تاخیر کر کے عصر پڑھتے ہوں۔

اس سے یہ بات معلوم ہو رہی ہے کہ جس نے پسندیدہ وقت کے آغاز و اختتام کے مابین جب بھی نماز پڑھ لی، وہ پسندیدہ ہوگی۔ پھر اس میں آدمی کی نیت اور اس کا تقویٰ ہی فرق ڈال سکتا ہے۔

اگر ان دونوں روایتوں کا باہمی موازنہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ عمرو بن عوف کی بستی دو میل کے فاصلے پر ہے اور قبا تقریباً تین میل، یعنی دو میل کے فاصلے پر وہ لوگوں کو نماز پڑھتے ہوئے پاتے ہیں اور تین میل کے فاصلے پر وہ صرف یہ کہتے ہیں کہ سورج ابھی بلند ہوتا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ سورج بلند ہے، مگر اتنا بھی بلند نہیں کہ لوگوں کو باجماعت نماز پڑھتے ہوئے پانا ممکن ہو۔ ہم نے سیدنا عمر کے خطوط میں فرسخین کے حوالے سے جو بات کہی ہے، اس کی بھی اس سے تائید ہوتی ہے کہ دو یا تین فرسخ ایک اندازہ کے لیے ہیں نہ کہ تعین کے لیے۔

جاوید احمد غامدی

اخلاقیات

(۵)

گزشتہ سے پیوستہ

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

اس کے علاوہ جو احکام ان آیتوں میں بیان ہوئے ہیں، اس کی تفصیلات درج ذیل ہیں:

اللہ کی عبادت

پہلا حکم یہ ہے کہ جب اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے تو پھر عبادت بھی اسی کی ہونی چاہیے۔ اس عبادت کے بارے میں اس سے پہلے اسی کتاب میں ''دین کی حقیقت'' کے زیرعنوان ہم بیان کر چکے ہیں کہ اس کی حقیقت خضوع اور تذلل ہے جس کا اولین ظہور پرستش کی صورت میں ہوتا ہے۔ پھر انسان کے عملی وجود کی رعایت سے یہی پرستش اطاعت کو شامل ہو جاتی ہے۔ پہلی صورت کے مظاہر تسبیح و تحمید، دعا و مناجات، رکوع و سجود، نذر، نیاز، قربانی اور اعتکاف ہیں۔ دوسری صورت میں آدمی کسی کو مستقل بالذات شارع و حاکم سمجھ کر اس کے لیے تحلیل و تحریم اور امر و نہی کے اختیارات مانتا اور اس کے حکم پر سر تسلیم خم کرتا ہے۔ اللہ، پروردگار عالم کا فیصلہ ہے کہ ان میں سے کوئی چیز بھی اس کے سوا کسی اور کے لیے نہیں ہو سکتی۔ 'قضی ربك الا تعبدوا الا اياه' کے الفاظ میں اللہ تعالیٰ نے اپنا یہی فیصلہ بیان فرمایا ہے۔ لہٰذا کوئی شخص اگر کسی کی تسبیح و تحمید کرتا ہے یا اس سے دعا و مناجات کرتا ہے یا اس کے لیے رکوع و سجود کرتا ہے یا اس کے حضور میں نذر، نیاز یا قربانی پیش کرتا ہے یا اس کے لیے اعتکاف کرتا ہے یا تحلیل و تحریم کے اختیارات مانتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس نے اللہ تعالیٰ کے اس فیصلے کو ماننے سے انکار کر دیا ہے۔ قرآن کے

مخاطبین میں سے جو لوگ اس جرم کے مرتکب تھے، ان کی غلطی اس نے اسی صراحت کے ساتھ واضح فرمائی ہے۔

سورج اور چاند کو سجدہ کرنے والوں سے کہا ہے:

لَا تَسۡجُدُوۡا لِلشَّمۡسِ وَلَا لِلۡقَمَرِ، وَاسۡجُدُوۡا لِلّٰهِ الَّذِیۡ خَلَقَهُنَّ، اِنۡ کُنۡتُمۡ اِیَّاهُ تَعۡبُدُوۡنَ. (حٰم السجدہ ۴۱: ۳۷)

''سورج کو سجدہ کرو اور نہ چاند کو، بلکہ اس اللہ کے سامنے سجدہ ریز رہو جس نے انھیں بنایا ہے، اگر تم اسی کی عبادت کرتے ہو۔''

بزرگوں سے دعا و مناجات کرنے والوں کو سمجھایا ہے:

وَالَّذِیۡنَ یَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ، لَا یَخۡلُقُوۡنَ شَیۡئًا وَّهُمۡ یُخۡلَقُوۡنَ، اَمۡوَاتٌ غَیۡرُ اَحۡیَآءٍ وَمَا یَشۡعُرُوۡنَ اَیَّانَ یُبۡعَثُوۡنَ. (النحل ۱۶: ۲۰۔۲۱)

''اور جنھیں یہ اللہ کے سوا پکارتے ہیں، وہ خود مخلوق ہیں، کچھ پیدا نہیں کرتے۔ مردہ ہیں، زندہ نہیں ہیں اور اُن کو پتا بھی نہیں کہ کب اٹھائے جائیں گے۔''

اللہ تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی کھیتیوں اور مویشیوں کو انھی ہستیوں کے حضور میں نذر اور قربانی کے لیے خاص کرنے والوں کو متنبہ کیا ہے:

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

وَجَعَلُوۡا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الۡحَرۡثِ وَالۡاَنۡعَامِ نَصِیۡبًا، فَقَالُوۡا: هٰذَا لِلّٰهِ بِزَعۡمِهِمۡ وَهٰذَا لِشُرَکَآئِنَا، فَمَا کَانَ لِشُرَکَآئِهِمۡ فَلَا یَصِلُ اِلَی اللّٰهِ، وَمَا کَانَ لِلّٰهِ فَهُوَ یَصِلُ اِلٰی شُرَکَآئِهِمۡ، سَآءَ مَا یَحۡکُمُوۡنَ. (الانعام ۶: ۱۳۷)

''اور خدا نے جو کھیتی اور چوپائے پیدا کیے ہیں، اُن میں ایک حصہ انھوں نے اللہ کا مقرر کر رکھا ہے۔ پھر کہتے ہیں: یہ حصہ تو اللہ کا ہے، ان کے گمان کے مطابق، اور یہ اُن کا ہے جنھیں ہم اللہ کے شریک ٹھیراتے ہیں۔ اس پر مزید یہ کہ جو حصہ ان کے شریکوں کا ہے، وہ تو اللہ کو نہیں پہنچتا اور جو اللہ کا ہے، وہ ان کے شریکوں کو پہنچ سکتا ہے[29]۔ کیا ہی بُرا فیصلہ ہے جو یہ لوگ کرتے ہیں۔''

علما اور فقہا کے لیے تحلیل و تحریم کے اختیارات مان کر ان کی اطاعت کرنے والوں کو توجہ دلائی ہے:

اِتَّخَذُوۡاۤ اَحۡبَارَهُمۡ وَرُهۡبَانَهُمۡ اَرۡبَابًا مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ وَالۡمَسِیۡحَ ابۡنَ مَرۡیَمَ وَمَاۤ اُمِرُوۡۤا اِلَّا لِیَعۡبُدُوۡۤا اِلٰهًا وَّاحِدًا لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ سُبۡحٰنَهٗ عَمَّا یُشۡرِکُوۡنَ. (التوبہ ۹: ۳۱)

''اپنے علما اور درویشوں کو انھوں نے اللہ کے سوا اپنا رب بنا لیا ہے اور مسیح ابن مریم کو بھی، دراں حالیکہ ان کو ایک ہی معبود کی عبادت کا حکم دیا گیا تھا۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ وہ پاک ہے اُن چیزوں سے جنھیں یہ شریک ٹھیراتے ہیں۔''

۲۹؎ یہ اس حماقت در حماقت کا ذکر ہے کہ بتوں کے نام کی بکری مر جائے تو اس کی تلافی لازماً خدا کے حصے میں سے کر دی جائے گی، لیکن اگر اس طرح کی کوئی آفت خدا کے نام پر نکالے ہوئے حصے پر آ جائے تو اس کی تلافی بتوں کے حصے میں سے نہیں ہوگی۔

چنانچہ اس طرح کی تحلیل وتحریم کو قرآن نے باطل قرار دیا اور بحیرہ، سائبہ، وصیلہ اور حام کے نام سے بعض جانوروں کے لیے جو ممنوعات اہل عرب نے قائم کر رکھے تھے، ان کے بارے میں صاف کہہ دیا کہ ان کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔

'بحیرۃ' اس اونٹنی کو کہتے تھے جس سے پانچ بچے پیدا ہو چکے ہوتے اور ان میں آخری نر ہوتا۔ اسی اونٹنی کے کان چیر کر اسے آزاد چھوڑ دیا جاتا تھا۔

'سائبۃ' اس اونٹنی کو کہتے تھے جسے کسی منت کے پورا ہو جانے کے بعد آزاد چھوڑ دیتے تھے۔

'وصیلۃ' بعض لوگ نذر مانتے تھے کہ بکری اگر نر جنے گی تو اسے بتوں کے حضور پیش کریں گے اور اگر مادہ جنے گی تو اپنے پاس رکھیں گے۔ پھر اگر وہ نر و مادہ، دونوں ایک ساتھ جنتی تو اس کو وصیلہ کہتے اور ایسے نر کو بتوں کی نذر نہیں کرتے تھے۔

'حام' اس سانڈ کو کہتے تھے جس کی صلب سے کئی پشتیں پیدا ہو چکی ہوتیں۔ اسے بھی آزاد چھوڑ دیتے تھے۔

ارشاد فرمایا ہے:

مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْ بَحِيْرَةٍ وَّلَا سَآئِبَةٍ وَّلَا وَصِيْلَةٍ وَّلَا حَامٍ، وَلٰكِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ، وَاَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ. (المائدہ ۵: ۱۰۳)	''اللہ نے کوئی بحیرہ، سائبہ، وصیلہ اور حام نہیں ٹھیرائے، لیکن یہ منکر اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں اور ان میں سے زیادہ عقل سے عاری ہیں۔''

اللہ کی عبادت کے معاملے میں قرآن کا یہی فیصلہ ہے جس کی بنا پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لینے سے منع کیا اور فرمایا ہے کہ اللہ یہود و نصاریٰ پر لعنت کرے، انھوں نے اپنے پیغمبروں کی قبروں کو مسجد بنا لیا۔[۳۰] رخصت ہونے سے پہلے یہ آپ کی آخری نصیحت تھی جس سے اس کی اہمیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

والدین سے حسن سلوک

دوسرا حکم یہ ہے کہ والدین سے حسن سلوک کیا جائے۔ اس کی تعلیم تمام الہامی صحائف میں دی گئی ہے۔ قرآن مجید نے یہاں اور اس کے علاوہ عنکبوت (۲۹) کی آیت ۸، لقمان (۳۱) کی آیات ۱۴۔ ۱۵ اور احقاف (۴۶) کی آیت ۱۵ میں یہی تلقین فرمائی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ انسانوں میں سب سے مقدم حق والدین کا ہے۔ چنانچہ اللہ

۳۰؎ مسلم، رقم ۹۷۲۔

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

کی عبادت کے بعد سب سے پہلے اسی کو ادا کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کے والدین ہی اس کے وجود میں آنے اور پرورش پانے کا ذریعہ بنتے ہیں۔لقمان اور احقاف میں یہ حکم جس طرح بیان ہوا ہے،اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں بھی ماں کا حق زیادہ ہے:

وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ، حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ وَهْنًا عَلٰى وَهْنٍ، وَّفِصٰلُهٗ فِيْ عَامَيْنِ اَنِ اشْكُرْ لِيْ وَلِوَالِدَيْكَ، اِلَيَّ الْمَصِيْرُ.
(لقمان ۳۱:۱۴)

''اور ہم نے انسان کو اس کے والدین کے بارے میں نصیحت کی ہے۔اس کی ماں نے ضعف پر ضعف اٹھا کر اس کو پیٹ میں رکھا اور اس کا دودھ چھڑانا دو سال میں ہوا۔ (ہم نے اس کو نصیحت کی ہے) کہ میرے شکر گزار رہو اور اپنے والدین کا شکر بجا لاؤ۔ بالآخر پلٹنا میری ہی طرف ہے۔''

بچے کی پرورش کے معاملے میں باپ کی شفقت بھی کچھ کم نہیں ہوتی،لیکن حمل، ولادت اور رضاعت کے مختلف مراحل میں جو مشقت بچے کی ماں اٹھاتی ہے،اس میں یقیناً اس کا کوئی شریک و سہیم نہیں ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اسی بنا پر ماں کا حق باپ کے مقابلے میں تین درجے زیادہ قرار دیا ہے[31]۔ تاہم اس فرق سے قطع نظر اللہ تعالیٰ کی نصیحت ان دونوں ہی کے بارے میں یہ ہے کہ اپنے پروردگار کے بعد انسان کو سب سے بڑھ کر انھی کا شکر گزار ہونا چاہیے۔ یہ شکر محض زبان سے ادا نہیں ہوتا۔اس کے چند لازمی تقاضے ہیں جو قرآن نے سورۂ بنی اسرائیل کی ان آیات میں بیان کر دیے ہیں۔

پہلی بات یہ فرمائی ہے کہ اپنے والدین کے ساتھ آدمی کو اس طرح پیش آنا چاہیے کہ وہ ظاہر و باطن میں ان کی عزت کرے،ان کے خلاف اپنے دل میں کوئی بے زاری نہ پیدا ہونے دے،ان کے سامنے سوء ادب کا کوئی کلمہ زبان سے نہ نکالے، بلکہ نرمی، محبت،شرافت اور سعادت مندی کا اسلوب اختیار کرے۔ ان کی بات مانے اور بڑھاپے کی ناتوانیوں میں ان کی دل داری اور تسلی کرتا رہے۔

اس بڑھاپے کا حوالہ بالخصوص جس مقصد سے دیا گیا ہے،اس کی وضاحت استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اس طرح کی ہے:

''...یہی زمانہ ہوتا ہے جس میں ان لوگوں کو ماں باپ بوجھ محسوس ہوتے ہیں جو ان کی ان قربانیوں اور جاں فشانیوں کو بھول جاتے ہیں جو انھوں نے ان کے لیے بچپن میں کی ہوتی ہیں۔سعادت مند اولاد تو اس بات کو یاد رکھتی ہے کہ جس طرح کبھی ایک مضغۂ گوشت کی صورت میں تجھ کو اپنے والدین کی گود میں ڈالا گیا تھا،اسی طرح اب میرے والدین ہڈیوں کے

---

[31] بخاری،رقم ۵۶۲۶۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

ایک ڈھانچے کی صورت میں میرے حوالے کیے گئے ہیں اور میرا فرض ہے کہ میں ان کے احسان کا بدلہ احسان کی صورت میں دوں۔لیکن ہر شخص اس بات کو یاد نہیں رکھتا۔ یہ اسی بات کی یاد دہانی ہے۔ ورنہ اصل حقیقت یہ ہے کہ والدین ہر دور میں محبت، تعظیم اور احسان کے حق دار ہیں۔'' (تدبر قرآن ۴/ ۴۹۶)

دوسری بات یہ فرمائی ہے کہ والدین کے سامنے اطاعت وفرماں برداری کے بازو ہر حال میں جھکے رہیں اور یہ اطاعت وفرماں برداری تمام تر مہر ومحبت اور رحمت وشفقت کے جذبے سے ہونی چاہیے۔ اس کے لیے 'واخفض لهما جناح الذل من الرحمة' کی تعبیر اختیار کی گئی ہے۔ اس میں یہ تلمیح ہے کہ والدین جس طرح بچے کو پرندوں کی طرح اپنے بازووں میں چھپا کر رکھتے ہیں، بچوں کو بھی چاہیے کہ ان کے بڑھاپے میں اسی طرح ان کو اپنی محبت واطاعت کے بازووں میں چھپا کر رکھیں۔ اس لیے کہ والدین کی شفقت کا حق اگر کچھ ادا ہوسکتا ہے تو اسی جذبے سے ہوسکتا ہے۔ اس کے بغیر یہ حق ادا کرنا کسی شخص کے لیے ممکن نہیں ہے۔

تیسری بات یہ فرمائی ہے کہ اس کے ساتھ ان کے لیے برابر دعا کی جائے کہ پروردگار جس طرح انھوں نے شفقت ومحبت کے ساتھ بچپن میں ہمیں پالا ہے، اسی طرح اب بڑھاپے میں آپ ان پر اپنی رحمت نازل فرمائیں۔ یہ دعا والدین کا حق ہے اور اس حق کی یاد دہانی بھی جو والدین سے متعلق اولاد پر عائد ہوتا ہے۔ پھر یہ اس جذبۂ محبت کی محرک بھی ہے جس کا مطالبہ اللہ تعالیٰ نے والدین سے حسن سلوک کے معاملے میں کیا ہے۔ سورۂ لقمان میں اس کے علاوہ اس حسن سلوک کے حدود بھی بیان ہوئے ہیں۔ لیکن یہ شریعت کا موضوع ہے، لہٰذا انھیں ہم آگے ''قانون معاشرت'' کے زیر عنوان بیان کریں گے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اس باب میں یہ ہیں:

ابن مسعود کی روایت ہے کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: اللہ تعالیٰ کو کون سا عمل سب سے زیادہ پسند ہے؟ آپ نے فرمایا: وقت پر نماز پڑھنا۔ میں نے پوچھا: اس کے بعد؟ فرمایا: والدین کے ساتھ اچھا برتاؤ۔[۳۲]

ابو ہریرہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس شخص کے لیے ذلت ہے، اس شخص کے لیے ذلت ہے، اس شخص کے لیے ذلت ہے۔ لوگوں نے پوچھا: کس کے لیے، یا رسول اللہ؟ فرمایا: جس کے ماں باپ یا ان میں سے کوئی ایک اس کے پاس بڑھاپے کو پہنچا اور وہ اس کے باوجود جنت میں داخل نہ ہوسکا۔[۳۳]

عبد اللہ بن عمرو کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک شخص نے جہاد کی اجازت چاہی۔ آپ نے

---

[۳۲] بخاری، رقم ۵۶۲۵۔

[۳۳] مسلم، رقم ۲۵۵۱۔

پوچھا: تمھارے والدین زندہ ہیں؟ عرض کیا: جی ہاں۔ فرمایا: پھر ان کی خدمت میں رہو، یہی جہاد ہے۔[۳۴]

ابوسعید خدری کہتے ہیں کہ یمن کے لوگوں میں سے ایک شخص جہاد کی غرض سے ہجرت کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوا۔ آپ نے پوچھا: یمن میں کوئی عزیز ہے؟ عرض کیا: میرے ماں باپ ہیں۔ فرمایا: انھوں نے اجازت دی ہے؟ عرض کیا: نہیں۔ فرمایا: جاؤ اور ان سے اجازت لو۔ اگر دیں تو جہاد کرو ورنہ ان کی خدمت کرتے رہو۔[۳۵]

معاویہ اپنے باپ جاہمہ سے روایت کرتے ہیں کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: یارسول اللہ، جہاد کے لیے جانا چاہتا ہوں اور آپ سے مشورے کے لیے حاضر ہوا ہوں۔ آپ نے پوچھا: تمھاری ماں زندہ ہے؟ عرض کیا: جی ہاں۔ فرمایا: تو اس کی خدمت میں رہو، اس لیے کہ جنت اس کے پاؤں کے نیچے ہے۔[۳۶]

عبداللہ بن عمرو کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: پروردگار کی خوشی باپ کی خوشی میں اور اس کی ناراضی باپ کی ناراضی میں ہے۔[۳۷]

ابوالدردا کہتے ہیں کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ جنت کا بہترین دروازہ باپ ہے، اس لیے چاہو تو اسے ضائع کرو اور چاہو تو اس کی حفاظت کرو۔[۳۸]

عمرو بن شعیب اپنی ماں سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتی ہیں کہ ایک شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے عرض کیا: میرے پاس کچھ مال ہے اور میری اولاد بھی ہے، لیکن میرے والد اس مال کے ضرورت مند ہیں۔ آپ نے فرمایا: تم اور تمھارا مال، دونوں والد ہی کے ہیں۔[۳۹]

[باقی]

۳۴؎ بخاری، رقم ۵۶۲۷۔

۳۵؎ ابوداؤد، رقم ۲۵۳۰۔

۳۶؎ نسائی، رقم ۳۱۰۴۔

۳۷؎ ترمذی، رقم ۱۸۹۹۔

۳۸؎ ترمذی، رقم ۱۹۰۰۔

۳۹؎ ابوداؤد، رقم ۳۵۳۰۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

پروفیسر خورشید عالم

عورت کی امامت

پچھلے دنوں ایک نیک سیرت اور پڑھی لکھی خاتون نے نیویارک (امریکا) میں جمعہ کی نماز میں مردوں اور عورتوں کی امامت کی۔ پاکستانی میڈیا میں ایک ہنگامہ بپا ہو گیا۔ نماز پڑھانے والی اور پڑھنے والوں کے خلاف فتوے جاری ہو گئے۔ ٹیلی وژن پر امامت کرنے والی خاتون کو برا بھلا کہا گیا۔ اس کے پیچھے نماز پڑھنے والوں کا اسلام خطرے میں پڑ گیا۔ یہ مسئلہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں جس پر ایمان کا دارومدار ہو۔ یہ فقہ کا ایک عام سا مسئلہ ہے جس پر دلیل سے بات کرنے کی اور اختلافی رائے کو برداشت کرنے کی ضرورت ہے۔ زیادہ سے زیادہ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس خاتون نے روایت کو توڑا اور جمہور فقہا کی رائے کے خلاف عمل کیا ہے۔ ہمارے ہاں یہ عام روش ہے کہ مسئلہ کی تحقیق کرنے کے بجائے اس کے خلاف عوام کے جذبات کو بھڑکا دیا جاتا ہے۔ ہمیں اس مسئلہ کو ایسے ہی حل کرنا چاہیے جیسے ہمارے فقہا نے حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے دلیل کی بنا پر اپنی اپنی رائے کا اظہار کیا ہے اور مخالفین نے بھی ان کی رائے کو وزن دیا ہے۔ اگر عورت کی امامت فتنہ ہے تو اسی لیبل کو بڑے بڑے فقہا پر بھی چسپاں کرنا پڑے گا۔

میں اس مسئلہ پر تحقیقی نظر ڈالوں گا اور قارئین اس کی روشنی میں اپنی رائے قائم کر سکتے ہیں۔

امام قاضی ابوالولید محمد بن احمد بن رشد القرطبی (متوفی ۵۱۵ھ) اپنی کتاب ''بدایۃ المجتہد'' میں فرماتے ہیں:

''عورت کی امامت کے بارے میں فقہا میں اختلاف ہے۔ جمہور فقہا کے نزدیک یہ جائز نہیں کہ عورت مردوں کی امامت کرے اور اس بارے میں اختلاف ہے کہ وہ عورتوں کی امامت کرے۔ امام شافعی نے اس کی اجازت دی ہے، مگر امام مالک نے اس سے منع کیا ہے۔ ابوثور اور طبری جمہور کی رائے سے ہٹ کر ان کی مطلقاً امامت کے قائل ہیں۔ جمہور فقہا کا اس مسئلہ

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

میں ـــــ کہ عورت مردوں کی امامت نہیں کر سکتی ـــــ اتفاق اس لیے ہے کہ اگر یہ جائز ہوتا تو صدر اول میں اس کی کوئی روایت ملتی اور اس لیے بھی کہ نماز میں عورتوں کا کھڑا ہونے کا طریقہ یہی تھا کہ وہ صف میں مردوں کے پیچھے کھڑی ہوتی تھیں۔اس سے معلوم ہوا کہ عورت کا مرد سے آگے کھڑا ہونا جائز نہیں۔پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

اخروھن حبث اخرھن اللّٰہ. ''ان کو پیچھے رکھو جہاں اللہ نے ان کو پیچھے رکھا ہے۔''

اسی لیے بعض فقہا نے عورتوں کے لیے عورت کی امامت کو جائز قرار دیا ہے بشرطیکہ نماز میں وہ سب ایک ساتھ کھڑی ہوں، علاوہ ازیں یہ بات بعض لوگوں سے صدر اول میں منقول ہے۔اور جن علما نے عورت کی امامت کو مطلقاً جائز سمجھا ہے، انھوں نے اس حدیث کی طرف رجوع کیا ہے جو ابوداؤد نے ام ورقہ سے روایت کی ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ام ورقہ کے گھر جایا کرتے تھے اور آپ نے ان کے لیے ایک مؤذن مقرر کیا اور انھیں حکم دیا کہ وہ اپنے اہل خاندان کی امامت کیا کریں۔''(۱/۱۰۵)

''بدایۃ المجتہد'' کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ عورت کی امامت کا مسئلہ اختلافی ہے۔عورت عورتوں کی امامت کرے یا عورت مردوں کی امامت کرے، دونوں باتوں میں اختلاف ہے۔ابراہیم بن خالد بن ایمان ابوثور (متوفی ۲۴۰ھ) جیسے محدث اور فقہ شافعی کے امام مجتہد اور ابوجعفر محمد بن جریر (متوفی ۳۱۰ھ) جیسے محدث، مفسر، مورخ اور مستقل فقہی مذہب کے امام نے جمہور علما کی رائے سے اختلاف کرتے ہوئے اس بات کو جائز قرار دیا ہے کہ عورت مردوں کی امامت کرے اور ان کی دلیل ایک مرفوع صحیح حدیث ہے۔

سنن ابی داؤد میں عورت کی امامت کے عنوان کے تحت ام ورقہ سے دو حدیثیں روایت کی گئی ہیں۔پہلی حدیث کا متن یوں ہے:

''ام ورقہ بنت نوفل سے روایت ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ بدر کے لیے نکلنے والے تھے تو میں نے کہا: اے اللہ کے رسول، مجھے بھی اپنے ساتھ اس غزوہ میں جانے کی اجازت دیجیے۔میں آپ کے مریضوں کی تیمارداری کروں گی، شاید اللہ تعالیٰ مجھے شہادت کی موت دے دے۔اللہ کے رسول نے فرمایا: اپنے گھر میں ٹھہری رہو یقیناً اللہ تعالیٰ تمھیں شہادت کی موت دے گا۔راوی کا قول ہے کہ اس بشارت کی وجہ سے لوگ انھیں شہیدہ کہتے تھے۔راوی کہتا ہے کہ وہ قرآن کی قاری (حافظہ) تھیں، چنانچہ انھوں نے نبی اکرم سے اپنے گھر میں ایک مؤذن مقرر کرنے کی اجازت طلب کی۔آپ نے انھیں اس کی اجازت دے دی۔راوی کا قول ہے کہ ان کا ایک مدبر غلام (جو مالک کی موت کے بعد آزاد ہو جاتا ہے) اور ایک لونڈی تھی۔یہ دونوں ایک رات اٹھ کر ان کے قریب آئے اور پلش کی چادر سے ان کو اس قدر دبا کر ڈھانپا کہ وہ مر گئیں۔وہ دونوں بھاگ گئے۔صبح کو حضرت عمر لوگوں کے درمیان کھڑے ہوئے اور فرمایا: جس کسی کو ان دونوں قاتلوں کا علم ہو یا جس نے بھی ان کو دیکھا ہو تو پکڑ کر میرے پاس لے آئے۔چنانچہ جب وہ لائے گئے تو حضرت عمر نے ان کو سولی پر لٹکا دیا۔وہ دونوں پہلے قاتل تھے جن کو مدینہ منورہ میں سولی پر لٹکایا گیا۔''(ابوداؤد)

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

حافظ ابن حجر عسقلانی نے اسے ''الاصابہ فی تمییز الصحابہ'' میں ام ورقہ کے ترجمہ (۴: ۵۰۵) میں ابن السکین کے حوالہ اور محمد بن فضیل کی سند سے بیان کی ہے اور اس میں اس قدر اضافہ کیا ہے:

''جب صبح ہوئی تو حضرت عمر نے فرمایا: بخدا کل شب میں نے اپنی خالہ ام ورقہ کی قرأت نہیں سنی۔ پہلے وہ اس کے محلّہ (دار) میں داخل ہوئے جب کچھ نظر نہ آیا تو ان کے گھر (بیـــت) میں داخل ہوئے تو وہ ایک کونے میں پلش کی چادر میں لپٹی پڑی تھیں۔ آپ نے کہا کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سچ کہا کرتے تھے: چلو چل کر شہیدہ سے ملاقات کریں۔ پھر آپ منبر پر چڑھ گئے۔''

دوسری حدیث ام ورقہ بنت عبداللہ بن حارث سے ایک اور سند سے مروی ہے، لیکن پہلی حدیث کامل تر ہے۔ اس حدیث کا متن یوں ہے:

''اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ان کے گھر آیا جایا کرتے تھے۔ آپ نے ایک موذن مقرر فرمایا تھا جو ام ورقہ کے لیے اذان دیتا تھا۔ آپ نے ان کو حکم دیا تھا کہ وہ اپنے خاندان والوں کی امامت کیا کریں۔ راوی عبدالرحمان کہتا ہے کہ میں نے ان کا مؤذن دیکھا تھا جو ایک بوڑھا شخص تھا۔'' (ابوداؤد)

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

مذکورہ حدیث میں ایک لغوی نکتے کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے کیونکہ اس کے بغیر امامت کی حدود کا تعین نہیں ہوسکتا۔ دوسری حدیث میں 'تـؤم اهل دارها' کی تعبیر استعمال ہوئی ہے نہ کہ 'اهل بيتها'۔ 'اهل البيت' کے معنی گھر والے ہیں جبکہ 'اهـل الـدار' کے معنی قبیلے والے، محلے والے اور خاندان والے ہیں۔ حافظ ابن حجر نے ''الاصابہ'' میں جو روایت نقل کی ہے، اس میں بھی ہے کہ حضرت عمر پہلے ان کے احاطے یا محلے (دار) میں داخل ہوئے پھر ان کے گھر (بیت) میں۔

امام راغب کے قول کے مطابق 'دار' کا لفظ شہر، علاقے، بلکہ سارے جہان کے لیے بولا جاتا ہے۔ ''المصباح المنیر'' میں ہے:

''اصل میں لفظ دار اس جگہ پر بولا جاتا ہے جو ارد گرد سے گھری ہوئی ہو، مثلاً دو پہاڑوں کے درمیان گھری ہوئی وادی کو بھی دار کہا جاتا ہے اور مجازاً اس کا اطلاق قبیلے پر ہوتا ہے۔''

احمد بن فارس بن زکریا (متوفی ۳۹۵) اپنی مشہور لغت کی کتاب ''معجم مقاییس اللغۃ'' میں 'الدار' کے متعلق لکھتے ہیں:

''اس سے مراد قبیلہ ہے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ہے: 'الا انبـئـكـم بـخير دور الانصار' کیا میں تمھیں انصار کے بہترین قبیلوں کے متعلق نہ بتاؤں۔ ایک اور حدیث میں ہے: 'فـلـم تبـق دار الانبـی فيهـا

المسجد ،یعنی کوئی ایسا قبیلہ نہ رہا جس میں مسجد نہ بنائی گئی ہو۔''

صاحب ''القاموس المحیط'' لکھتے ہیں کہ:

''دار کا اطلاق ہر کھلی زمین پر ہوتا ہے جو پہاڑوں کے درمیان واقع ہو اور ہر اس چیز پر جس کو کسی چیز نے دائرے کی مانند گھیر رکھا ہو۔''

ام ورقہ بنت عبداللہ بن حارث بن عویمر بن نوفل الانصاری رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحابیہ تھیں۔ انھوں نے رسول اکرم کے دست مبارک پر بیعت بھی کی تھی۔ اس زمانہ میں صراحت کے ساتھ اگر کسی عورت کے بارے میں حافظہ ہونے کا ذکر ملتا ہے تو صرف انھی کے متعلق ملتا ہے۔ ان کی قرأت اتنی اچھی تھی کہ حضرت عمر رات کو بڑے ذوق وشوق سے ان کی قرأت کو سنتے تھے۔ غالباً وہ اونچی آواز سے قرأت کرتی ہوں گی۔ ایک رات حضرت عمر نے جب ان کی قرأت کو نہ سنا تو ان کے بارے میں انھیں فکر لاحق ہوگئی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر میں ان کا مرتبہ یہ تھا کہ آپ نے ان کو شہیدہ ہونے کی بشارت دی تھی اور وہ اکثر ان کے یہاں جایا کرتے تھے اور اپنے صحابۂ کرام سے کہتے: ''چلو چل کر شہیدہ سے ملاقات کریں۔'' یقیناً آنحضرت نے ام ورقہ کے حفظ قرآن اور حسن قرأت کی وجہ سے انھیں امامت کرنے کا حکم دیا وہ اپنے علاقے یا محلے کی بہترین قاری ہوں گی۔ کیونکہ امامت کی اہلیت کے بارے میں امام احمد، مسلم اور نسائی نے ابوسعید خدری سے روایت کی ہے کہ سب سے پہلے امامت کا حق دار وہ ہے جو قرآن کی سب سے بہتر قرأت کرنے والا ہو اور اگر قرأت میں سب برابر ہوں تو پھر وہ جو سنت کا سب سے زیادہ جاننے والا ہو، پھر وہ جس نے پہلے ہجرت کی ہو، پھر وہ جو عمر میں بڑا ہو۔ اس حدیث میں مرد یا عورت کی کوئی تخصیص نہیں۔ اسی معیار کے مطابق ام ورقہ اپنے محلے کی امامت کی حق دار ٹھہریں۔

یہ حدیث مسند امام احمد بن حنبل (متوفی ۲۴۱ھ)، طبقات ابن سعد (متوفی ۲۳۵ھ)، صحیح ابن خزیمہ (متوفی ۳۱۱ھ)، سنن دار قطنی (متوفی ۳۸۵ھ)، مستدرک حاکم (متوفی ۴۰۵ھ)، سنن کبریٰ بیہقی (متوفی ۴۸۵ھ)، کنز العمال علی المتقی (متوفی ۹۷۵ھ) میں مروی ہے۔

امام دارقطنی نے مذکورہ حدیث کو دو مرتبہ روایت کیا ہے۔ ایک روایت کا متن وہی ہے جو ابوداؤد کی روایت کا ہے۔ مگر انھوں نے ''کتاب الصلوٰۃ باب ذکر الجماعۃ واہلہا وصفۃ الامام'' میں اسے یوں روایت کیا ہے:

''ام ورقہ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول نے اجازت دے دی تھی کہ اس کے لیے اذان دی جائے اور اقامت کہی جائے اور وہ اپنی عورتوں کی امامت کیا کرتی تھیں۔''

اس روایت کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ وہ اپنی عورتوں کی امامت کیا کرتی تھی۔ یہ دارقطنی کے اپنے الفاظ ہیں

حدیث کے الفاظ نہیں، یہ ان کی اپنی رائے ہے۔ سنن دار قطنی کے علاوہ حدیث کی کسی کتاب میں یہ اضافہ نہیں، اس لیے اس اضافے کو بطور دلیل پیش نہیں کیا جا سکتا۔

حدیث مذکور کا فن حدیث کی رو سے مقام

حافظ ابن حجر عسقلانی ''التلخیص الحبیر'' میں فرماتے ہیں کہ اس حدیث کے ایک راوی ولید بن عبداللہ بن جمیع مجہول الحال ہیں، مگر ابن حبان نے ان کو ثقہ شمار کیا ہے۔ زیلعی نے ''نصب الرایۃ'' (۳/۳۶) میں کہا ہے کہ منذری کا قول ہے کہ ولید بن جمیع کے بارے میں کلام ہے، مگر مسلم نے ان سے روایت کی ہے۔

ابن قطان نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ ولید بن جمیع اور عبدالرحمان مجہول الحال ہیں، لیکن میں (زیلعی) کہتا ہوں کہ ابن حبان نے دونوں کو ثقہ شمار کیا ہے۔ ابو داؤد کی شرح ''بذل المجہود'' میں ہے کہ ولید بن جمیع کو ابن معین، عجلی اور ابن سعد نے ثقہ مانا ہے۔ امام احمد، ابو داؤد اور ابو زرعہ کا قول ہے کہ اس سے روایت میں کوئی حرج نہیں۔

''ارواء الغلیل'' میں دور حاضر کے سب سے بڑے محدث ناصر الدین البانی فرماتے ہیں:

> ''منذری نے ولید بن عبداللہ کو مجہول ٹھہرایا ہے اور میں نے صحیح ابو داؤد میں اس کا جواب دیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ مسلم نے اسے حجت تسلیم کیا ہے اور ابن معین کی طرح ایک جماعت نے اسے ثقہ گردانا ہے۔'' (۲/۲۵۶)

دوسری حدیث کے ایک راوی عبدالرحمان خلاد الانصاری کے بارے میں حافظ ابن حجر عسقلانی نے ''التقریب'' میں کہا ہے کہ وہ مجہول الحال ہے، مگر ''التلخیص الحبیر'' میں وہ کہتے ہیں کہ ابن حبان نے اسے ثقہ مانا ہے۔ ''السیل الجرار'' میں امام شوکانی (متوفی ۱۲۵۰ھ) کا قول ہے کہ اس حدیث کی سند میں عبدالرحمان بن خلاد الانصاری مجہول الحال ہے، لیکن ابن حبان نے اسے ثقہ شمار کیا ہے۔

ابن خزیمہ نے ام ورقہ کی حدیث کو صحیح قرار دیا ہے اور ناصر الدین البانی نے ''ارواء الغلیل'' میں ''التعلیق المغنی'' کے مؤقف کے حوالے سے بتایا ہے کہ:

> ''علامہ عیسیٰ نے بھی اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے۔ لیکن میری رائے یہ ہے کہ یہ حدیث حسن ہے۔''

اس حدیث کی صحت کی وجہ سے کم و بیش ہر مسلک کے فقہا نے اس حدیث سے انکار نہیں کیا، یہ الگ بات ہے کہ اس حدیث کی تشریح انھوں نے مختلف طریقوں سے کی ہے۔ جن فقہا نے اس حدیث کی بنا پر مردوں کے لیے عورت کی امامت کو جائز سمجھا ہے، ان کی نقلی دلیل خاصی مضبوط معلوم ہوتی ہے۔

فقہی آرا کا جائزہ

مذکورہ حدیث کی بنا پر فقہا عورت کو امامت کا حق دار سمجھتے ہیں۔ ''البدائع والصنائع'' میں امام کاسانی حنفی فرماتے ہیں:

''عام طور پر عورت امامت کی اہل ہے، یہاں تک کہ وہ عورتوں کی امامت کرا سکتی ہے۔''

''فتح القدیر'' میں محقق ابن الہمام کا بھی یہی قول ہے۔ ''السیل الجرار'' میں امام شوکانی کا قول ہے کہ حدیث ام ورقہ سے ثابت ہوتا ہے کہ عورت کی امامت عورتوں کے بارے میں صحیح ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا حکم دیا ہے۔ ''الفقہ علی المذاہب الاربعہ'' (۴۰۹/۱) میں ہے کہ اگر مقتدی عورتیں ہوں تو سوائے امام مالک کے سب ائمہ عورت کی امامت کو جائز سمجھتے ہیں۔ حضرت عائشہ اور حضرت ام سلمہ عورتوں کی امامت کرتی رہی ہیں۔ ''المحلی'' (۲۳۰/۴) میں طاؤس کے حوالہ سے کہا گیا ہے کہ حضرت عائشہ اذان بھی دیتی تھیں اور اقامت بھی کہتی تھیں۔ عورت امامت کی اہل ہے۔ امام مالک کے علاوہ سب ائمہ کا اس پر اتفاق ہے۔ اختلاف صرف اس بات میں ہے کہ آیا وہ مردوں کی امامت کر سکتی ہے یا نہیں؟

فقہا نے ام ورقہ کی روایت کی ایک تشریح تو یہ کی ہے کہ اس میں صرف عورتوں کی امامت کا حکم ہے اور وہ دار قطنی کی دوسری روایت کا یہ جملہ 'وتؤم نساءها' (اور وہ اپنی عورتوں کی امامت کیا کرتی تھیں) بطور دلیل پیش کرتے ہیں۔ صحاح ستہ میں سے سنن ابی داؤد سمیت حدیث کی کئی ایک کتابوں میں یہ حدیث مذکور ہے، لیکن دار قطنی کے علاوہ کسی نے یہ جملہ استعمال نہیں کیا، بلکہ یہ لکھا ہے 'امرها ان تؤم اهل دارها' نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو حکم دیا کہ اپنے اہل خاندان کی امامت کرے۔ اگر دار قطنی کی دوسری روایت کو غور سے دیکھا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ دار قطنی کے اپنے الفاظ ہیں۔ اس روایت کا متن ملاحظہ فرمائیں:

''ام ورقہ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول نے اجازت دے دی تھی کہ ان کے لیے اذان دی جائے اور اقامت کہی جائے اور وہ اپنی عورتوں کی امامت کیا کرتی تھیں۔''

یہ آخری جملہ پہلے جملے سے کٹا ہوا ہے اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ الفاظ ام ورقہ کے نہیں، بلکہ دار قطنی کے ہیں اور یہ ان کی ذاتی رائے ہے۔ عورت محض عورتوں کی امامت کرے اس کی تردید ابن قدامہ نے ''المغنی'' (۱۹۸/۲) میں یہ کہہ کر کی ہے کہ:

''ام ورقہ بنت عبداللہ بن حارث کے لیے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موذن مقرر کیا اور انھیں حکم دیا کہ وہ اپنے اہل خاندان (محلّہ) کی امامت کرے۔ یہ حکم مردوں اور عورتوں کے لیے عام ہے۔''

امیر صنعانی (متوفی ۱۱۸۲ھ) ''بلوغ المرام'' کی شرح ''سبل السلام'' میں کہتے ہیں:

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

’’حدیث ام ورقہ ابوداؤد نے روایت کی ہے اور ابن خزیمہ نے اسے صحیح گردانا ہے۔اس حدیث میں دلیل ہے کہ عورت اپنے اہل خاندان کی امامت کرے گی، خواہ اس میں مرد ہی کیوں نہ ہوں، کیونکہ ان کا موذن روایت کے مطابق بوڑھا آدمی تھا ظاہر ہے وہ ان کی امامت میں نماز پڑھتا تھا۔اسی طرح ان کا غلام اور لونڈی ان کے پیچھے نماز ادا کرتے تھے۔‘‘(۲/۳۵)

اسی طرح ’’الروض المربع شرح زاد المستقنع ‘‘ (۲/۳۱۲، حاشیہ) میں عبدالرحمان بن محمد بن قاسم النجدی لکھتے ہیں کہ ان کو نبی پاک نے حکم دیا کہ وہ اپنے خاندان والوں کی امامت کیا کریں، خواہ اس میں مرد ہی کیوں نہ ہوں۔مگر جمہور اہل علم اس کے مخالف ہیں۔دور حاضر کے مشہور محقق ڈاکٹر حمید اللہ سے سوال کیا گیا کہ کیا عورت صرف عورتوں کی امامت کرسکتی ہے؟ ان کا جواب ’’خطبات بہاول پور‘‘ میں یوں ہے:

’’میں اس بات کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں کہ انھیں صرف عورتوں کے لیے امام بنایا گیا تھا۔حدیث میں اہل خاندان کے الفاظ ہیں، اہل کے معنی صرف عورتوں کے نہیں ہوتے۔پھر اس حدیث میں بیان کیا گیا ہے کہ ان کا ایک مؤذن تھا، جو ایک مرد تھا اور مزید تفصیلات بھی ملتی ہیں کہ ان کے غلام بھی تھے، ظاہر ہے کہ غلام ان کی امامت میں نماز پڑھتے ہوں گے۔ غرض یہ کہ امامت صرف عورتوں کے لیے نہیں تھی، بلکہ مردوں کے لیے بھی تھی۔‘‘(۴۲۰)

بعض فقہا اس بات کو تو تسلیم کرتے ہیں کہ اس حدیث میں امامت کا حکم مردوں اور عورتوں دونوں کے لیے ہے، مگر وہ اس حکم کو نوافل تک محدود سمجھتے ہیں اور فرضوں کے لیے ممنوع قرار دیتے ہیں۔حاکم نے مستدرک میں حدیث کو ایک اضافے کے ساتھ روایت کیا ہے جس کے الفاظ یہ ہیں کہ:

’’نبی کریم نے ان کو حکم دیا کہ اپنے اہل خاندان کی فرائض میں امامت کریں۔‘‘

امام ابن تیمیہ ’’فتاویٰ‘‘ (۲۳/۲۴۸) میں فرماتے ہیں کہ امام احمد بن حنبل کا مشہور قول ہے کہ انھوں نے بوقت ضرورت عورتوں کو مردوں کی امامت کی اجازت دی ہے، مثلاً اگر قاری عورت کے علاوہ اور کوئی قاری نہ ہو تو وہ مردوں کو نماز تراویح پڑھا سکتی ہے۔چنانچہ ’’المغنی‘‘ میں ابن قدامہ کہتے ہیں کہ ’’ہمارے بعض (حنبلی) اصحاب کا قول ہے کہ عورت کے لیے نماز تراویح میں مردوں کی امامت جائز ہے۔‘‘ ابن قدامہ ان اصحاب کی مخالفت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لیے مؤذن مقرر کیا تھا جس سے پتا چلتا ہے کہ فرائض میں امامت کی اجازت دی گئی، کیونکہ اذان تو صرف فرضوں کے لیے دی جاتی ہے۔

ان دلائل سے واضح ہو گیا کہ ام ورقہ فرائض میں عورتوں اور مردوں کی امام تھیں۔

بعض فقہا بالخصوص احناف کی رائے ہے کہ امامت کا یہ حکم اسلام کے ابتدائی دور میں تھا بعد میں منسوخ ہو گیا۔ ’’البدائع والصنائع‘‘ کے مصنف کی بھی یہی رائے ہے، مگر ابن الہمام الحنفی جیسے محقق نے ’’فتح القدیر‘‘ میں اس رائے

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

پر سخت اعتراض وارد کیا ہے اور مستدرک امام محمد کی کتاب الآثار اور ابوداؤد کی روایات، خاص طور پر ام ورقہ کی حدیث پیش کر کے اس رائے کا باطل قرار دیا ہے۔ اس حکم کے منسوخ ہونے کی کوئی دلیل نہیں۔ ''طبقات ابن سعد'' اور ''الاستیعاب'' میں ام ورقہ کے ترجمہ میں یہ بات واضح طور پر کہی گئی ہے :

''ام ورقہ اپنے اہل خاندان کی امامت کرتی رہیں حتیٰ کہ ان کے غلام اور لونڈی نے ان کو اوپر سے ڈھانپ کر ان کا سانس بند کر دیا۔'' (۴۵۵/۸)، (۱۹۱۵/۴)

ڈاکٹر حمید اللہ ''خطبات بہاول پور'' میں رقم طراز ہیں:

''اس حدیث کے متعلق یہ گمان ہوسکتا ہے کہ یہ شاید ابتداے اسلام کی بات ہو اور بعد میں اللہ کے رسول نے اسے منسوخ کر دیا ہو، لیکن اس کے برعکس یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت ام ورقہ حضرت عمر کے زمانے تک زندہ رہیں اور اپنے فرائض سرانجام دیتی رہیں یہ بات ویسے بھی عجیب سی معلوم ہوتی ہے کہ ابتدائی زمانہ میں جب خواتین زیادہ تر حفظ اور قرأت سے ناآشنا تھیں ان کو امامت کی اجازت دی گئی ہو اور بعد میں جب بے شمار خواتین اس فن میں ماہر ہوگئیں تو انھیں امامت سے روک دیا گیا ہو۔'' (۳۵)

وہ فقہا جو اس بات کے قائل ہیں کہ عورت مردوں کی امامت کر سکتی ہے، انھوں نے حضرت ام ورقہ کی حدیث سے دو طرح استدلال کیا ہے۔ کچھ فقہا کا خیال ہے کہ عورت ضرورت کے تحت مردوں کی امامت کر سکتی ہے جیسا کہ اس ضمن میں امام ابن تیمیہ نے امام احمد بن حنبل کا قول نقل کیا ہے جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ صاحب ''المغنی'' کی بھی یہی رائے ہے کہ اس اجازت کو ام روقہ سے مخصوص سمجھا جائے گا۔ ابوداؤد کی ''شرح عون المعبود'' کے مصنف کا بھی یہی قول ہے کہ ام ورقہ کا معاملہ خاص معاملہ ہے، اسے عام اصول نہیں بنایا جا سکتا۔ ڈاکٹر حمید اللہ نے بھی اس رائے کی تائید کی ہے۔ وہ ''خطبات بہاول پور'' میں کہتے ہیں:

''بعض اوقات عام قاعدے میں استثنا کی ضرورت پیش آتی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے استثنائی ضرورتوں کے لیے یہ تقرر فرمایا تھا۔ چنانچہ میں اپنے ذاتی تجربے کی ایک چیز بیان کرتا ہوں۔ پیرس میں چند سال پہلے کا واقعہ ہے کہ ایک افغان لڑکی طالب علم کے طور پر آئی۔ ہالینڈ کا ایک طالب علم جو اس کا ہم جماعت تھا اس پر عاشق ہو گیا۔ عشق اتنا شدید تھا کہ اس نے اپنا دین بدل کر اسلام قبول کر لیا۔ ان دونوں کا نکاح ہوا۔ اگلے دن وہ لڑکی میرے پاس آئی اور کہنے لگی کہ بھائی صاحب میرا شوہر مسلمان ہو گیا ہے اور وہ اسلام پر عمل بھی کرنا چاہتا ہے، لیکن اسے نماز نہیں آتی اور اسے اصرار ہے کہ میں خود امام بن کر نماز پڑھاؤں۔ کیا وہ میری اقتدا میں نماز پڑھ سکتا ہے؟ میں نے اسے جواب دیا کہ اگر آپ کسی عام مولوی صاحب سے پوچھیں گے تو وہ کہے گا کہ جائز نہیں، لیکن میرے ذہن میں رسول اللہ کے طرز عمل کا ایک واقعہ حضرت ام ورقہ کا ہے۔ اس لیے استثنائی طور پر تم امام بن کر نماز پڑھاؤ۔ تمہارے شوہر کو چاہیے کہ وہ مقتدی بن کر تمھارے پیچھے نماز پڑھے اور جلد از جلد

قرآن کی ان سورتوں کو یاد کرے جو نماز میں کام آتی ہیں۔ کم از کم تین سورتیں یاد کرے۔ پھر اس کے بعد وہ تمھارا امام بنے اور تم اس کے پیچھے نماز پڑھو۔'' (۳۵)

یہ ڈاکٹر صاحب کی رائے ہے، مگر ابوسعید خدری کی روایت کے مطابق اس کا خاوند اس وقت تک امامت کا حق دار نہیں ہو گا جب تک وہ اپنی بیوی سے بہتر قرأت نہ کرنے لگے۔

بعض فقہا نے حضرت ام ورقہ کی حدیث کے پورے متن کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ رائے قائم کی ہے کہ عورت مطلقاً مردوں کی امامت کر سکتی ہے۔ ابوثور ابراہیم بن خالد بن یمان کلبی بغدادی (متوفی ۲۴۰ھ)، اسماعیل بن یحییٰ بن اسماعیل المزنی (متوفی ۲۶۴ھ) اور امام ابوجعفر محمد بن جریر الطبری (متوفی ۳۱۰ھ) کی یہی رائے ہے۔ ان میں ابوثور اور مزنی امام شافعی کے قریب ترین ساتھیوں میں سے تھے۔ دونوں اپنے مذہب کے امام مجتہد تھے۔ ابوثور کے بارے میں امام احمد بن حنبل کا قول ہے کہ ''میں سنت کے بارے میں ان کے علم کو پچاس برس سے جانتا ہوں۔ مجھے تو وہ سفیان ثوری کی شکل میں معلوم ہوتے ہیں۔'' امام نسائی کا قول ہے کہ ''وہ ثقہ فقہا میں شمار ہوتے ہیں۔'' ابوعبداللہ حاکم کا قول ہے کہ ''اہل بغداد ان پر بجا فخر کرتے ہیں۔ وہ اپنے زمانے میں ان کے مفتی اور نمایاں محدثین میں سے تھے۔'' امام مسلم (صحیح کے علاوہ) ابوداؤد اور ابن ماجہ نے ان سے حدیث روایت کی ہے۔ ابن قدامہ نے ''المغنی'' (۲:۱۹۸) میں ان کا قول نقل کیا ہے کہ ''جو مرد عورت کے پیچھے نماز پڑھے وہ نماز کا اعادہ نہ کرے۔'' اور مزنی نے بھی انھی کے قول پر قیاس کیا ہے۔ مزنی کو 'طبقات الشافعیہ' میں امام جلیل کے لقب سے نوازا گیا ہے۔ امام شافعی ان کے بارے میں فرماتے ہیں کہ ''اگر وہ شیطان سے مناظرہ کریں تو اس پر بھی غالب آ جائیں۔'' وہ بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں جن میں سے ''مختصر المزنی'' کافی مشہور کتاب ہے۔ امام ابوجعفر الطبری محدث، مفسر، فقیہ اور مورخ ہیں۔ وہ ایک مستقل مذہب کے امام ہیں۔ ان کی یہ رائے بھی ہے کہ عورت کو ہر معاملہ میں قضا کا حق حاصل ہے، ان تینوں ائمہ نے اپنے اجتہاد کی بنا پر اختلاف کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مسئلہ قابل اجتہاد ہے۔

جن فقہا نے اس بات کی مخالفت کی ہے کہ عورت مردوں کی امامت کرے، انھوں نے دو حدیثوں اور اجماع کی دلیل پیش کی ہے۔

ایک حدیث وہ ہے جسے خاص طور پر حنفی فقہا نے پیش کیا ہے۔ وہ یوں ہے: 'اخرو هن حيث اخر هن الله' ''ان عورتوں کو وہیں پیچھے رکھو جہاں اللہ نے انھیں پیچھے رکھا ہے۔'' یعنی وہ نماز کی صف میں مردوں کے پیچھے کھڑی ہوتی ہیں، اس لیے انھیں وہیں رہنے دو آگے نہ کرو۔ مشہور حنفی محقق ابن الہمام اس حدیث کے بارے میں فرماتے ہیں:

''اگرچہ مشاہیر نے اس کا ذکر کیا ہے، لیکن اس کا مرفوع ہونا ثابت نہیں۔'' (بحوالہ بذل المجہود)

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

زیلعی نے ''نصب الرایۃ'' میں (۳/۳۶) اس حدیث پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ مصنف عبدالرزاق میں یہ حدیث عبداللہ بن مسعود تک موقوف ہے اور مذکورہ الفاظ عبداللہ بن مسعود کے ہیں۔ عبدالرزاق ہی کی سند سے طبرانی نے اسے معجم میں روایت کیا ہے۔ سروجی نے الغایہ میں لکھا ہے کہ ''ہمارے شیخ صدر سلیمان اسے یوں روایت کرتے تھے: 'الخمر ام الخبائث والنساء حبائل الشیطان واخروھن من حیث اخروھن اللّٰہ' (شراب برائیوں کی جڑ ہے اور عورتیں شیطان کے پھندے۔ انھیں پیچھے رکھو، کیونکہ اللہ نے انھیں پیچھے رکھا ہے)۔'' اور وہ اسے مسند رزین کی طرف منسوب کرتے ہیں اس کا قول ہے کہ یہ حدیث بیہقی کی ''دلائل النبوۃ'' میں ہے۔ میں نے اسے تلاش کیا، مگر اس میں نہ موقوف حدیث موجود ہے نہ مرفوع۔ مجھے جو مرفوع حدیث ملی، اس کے الفاظ یہ ہیں: 'الخمر ام الخبائث والنساء حبائل الشیطان و الشباب شعبة الجنون' (شراب ساری برائیوں کی جڑ ہے، عورتیں شیطان کے پھندے ہیں اور جوانی جنون کی ایک شاخ ہے)۔ اس حدیث میں 'اخروھن' والا ٹکڑا سرے سے موجود نہیں۔ یہ دلیل کہ عورتیں چونکہ صف میں پیچھے کھڑی ہوتی ہیں، اس لیے وہ آگے کھڑی نہیں ہو سکتیں۔ حضرت ام ورقہ کی حدیث اس خیال کی نفی کرتی ہے۔ اگر اس منطق کو تسلیم کر لیا جائے تو پھر ممیّز بچے کی بھی امامت ناجائز ہو جائے گی، کیونکہ وہ بھی تو صف میں پیچھے کھڑا ہوتا ہے حالانکہ امام شافعی کے نزدیک ممیّز بچہ جمعہ کے علاوہ سب فرضوں کی امامت کر سکتا ہے۔ امام بخاری اور نسائی نے عمرو بن مسلمہ سے روایت کی ہے کہ انھوں نے چھ یا سات سال کی عمر میں امامت کی۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

دوسری حدیث جس کا حوالہ احناف کے علاوہ اکثر دوسرے فقہا دیتے ہیں، وہ یوں ہے:

لا تومن امراة رجلا ولا اعرابی مهاجر ولا فاجر مومنا الا ان یقهره یخاف سوطه.	''نہ عورت مرد کی امامت کرے نہ بدو (دیہاتی) مہاجر کی اور نہ فاجر مومن کی سوائے اس کے کہ ایسا سلطان اس پر دباؤ ڈالے جس کے کوڑے سے وہ خوف زدہ ہو۔''

اس حدیث کو ابن ماجہ نے ''کتاب الصلوٰۃ'' میں حضرت جابر سے روایت کیا ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی ''التلخیص الحبیر'' میں کہتے ہیں کہ اس حدیث کو عبداللہ بن محمد عدوی نے علی بن زید بن جدعان سے روایت کیا ہے۔ امام وکیع کا عدوی کے بارے میں قول ہے کہ وہ حدیثیں وضع کیا کرتا تھا۔ انھوں نے اس کے شیخ کو بھی ضعیف ٹھیرایا ہے۔ ''سبل السلام'' میں امیر صنعانی کہتے ہیں کہ اس حدیث کی ایک اور سند ہے جس کا ایک راوی عبدالملک بن حبیب ہے جس پر سرقہ حدیث کی تہمت ہے۔

اگراس حدیث کے متن پر غور کیا جائے تو ایک اور بات سامنے آتی ہے۔اس حدیث میں تین شخصوں کی امامت کی ممانعت ہے عورت کی، بدو کی اور فاجر کی۔ان میں سے بدو کی امامت کے متعلق فقہا کا قول ہے کہ اس کا تعلق ابتداے اسلام سے تھا جب بدو کتاب وسنت سے آگاہ نہیں تھے،لیکن بعد میں جب ان کا ایمان پختہ ہو گیا اور صحبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کو کتاب وسنت سے آگاہی ہوگئی تو یہ ممانعت اٹھالی گئی۔فاسق وفاجر کی امامت کے جواز اور عدم جواز کے بارے میں بحث سے فقہ کی کتابیں بھری پڑی ہیں۔اگر فاسق وبدعتی کو فاسق جانتے ہوئے اس کے پیچھے نماز پڑھی جائے تو امام احمد اور مالک اسے جائز نہیں سمجھتے جبکہ امام ابوحنیفہ اور شافعی اسے جائز سمجھتے ہیں کیونکہ عبداللہ بن مسعود نے ولید بن عقبہ کے پیچھے نماز پڑھی حالانکہ وہ شراب پیتا تھا اور ایک دفعہ اس نے فجر کی چار رکعت پڑھائیں۔عبداللہ بن عمر نے مختار کے پیچھے نماز پڑھی حالانکہ اس پر الحاد کی تہمت تھی۔امام بخاری نے اپنی تاریخ میں عبدالکریم سے تخریج کی ہے کہ انھوں نے دس صحابۂ کرام کو دیکھا جو ظالم اور جابر ائمہ کے پیچھے نماز پڑھا کرتے تھے۔تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ بھی وقت کے تقاضوں کے زیر اثر تھی،جب حدیث میں مذکور بدو اور فاسق کی امامت بعد میں جائز ٹھہری تو عورت بے چاری نے کیا قصور کیا ہے کہ اس کی امامت ابھی تک ناجائز ہو۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

جب عورت کی امامت کی مخالفت کرنے والے فقہا کی پیش کردہ دونوں حدیثیں ضعیف اور موضوع ٹھیریں تو کیوں نہ ہم فقہ کے بنیادی اصول کی طرف رجوع کریں کہ جس کی نماز درست تصور ہوگی،اس کی امامت بھی درست تصور ہوگی۔

بعض علما اور خصوصاً ہمارے یہاں کے مذہبی پیشوا جو مرد کو صرف مرد ہونے کی وجہ سے عورت سے افضل سمجھتے ہیں، وہ اس سلسلہ میں ایسی قرآنی آیات پیش کرتے ہیں جن کا امامت کے موضوع سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔مثلاً 'الرجال قوامون علی النساء'(۴:۳۴)''مرد عورتوں کے ذمہ دار ہیں۔''؛ 'وللرجال علیھن درجة'(۲:۲۲۸)''اور مردوں کو ان پر ایک درجہ ہے۔''ان دونوں آیات کا تعلق میاں بیوی کے عائلی اور معاشرتی حالات سے ہے،امامت کے مسئلہ سے ان کا دور کا بھی واسطہ نہیں۔دین اور شریعت کے اعتبار سے مرد اور عورت ہر ایک کو اپنے اعمال کی جزا اور سزا ملے گی۔کسی کے اعمال صالحہ اکارت نہیں ہوں گے۔ان میں سے اللہ کے نزدیک وہی مکرم ہوگا جو متقی ہوگا۔فضیلت کا بس یہی پیمانہ ہے۔مرد کو صرف مرد ہونے کی وجہ سے عورت پر قطعی کوئی فضیلت حاصل نہیں۔یہ سوچ حکمت قرآنی سے متصادم ہے۔

عبدالستار غوری

اُردو اِملا ـــــ چند گزارشات

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

اکتوبر ۲۰۰۴ء کے ''اخبار اردو'' میں محترمہ نجمہ بانو کا شذرہ بعنوان 'اُردو املا: چند اصول اور قاعدے' شائع ہوا ہے۔اس میں محترم ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کے مضمون 'اُردو املا: چند اصول اور قاعدے' شائع شدہ ''اخبار اردو'' جون ۲۰۰۴ء کا حوالہ دیا گیا ہے۔ یہ مضمون بہت اہم ہے۔ضرورت اس بات کی ہے کہ اس طرح کے مضامین لگا تار اخبارات ورسائل میں شائع ہوتے رہیں، تاکہ املا کے بارے میں عوام ہی کی طرف سے نہیں، بلکہ بڑے بڑے علمی اداروں اور اہم شخصیات کی طرف سے بھی جس غفلت کا مظاہرہ کیا جارہا ہے، اس کا تدارک ہو سکے۔

محترم ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کے مضمون کے سلسلے میں چند گزارشات پیش ہیں:

ڈاکٹر صاحب پیراگراف '۴' میں لکھتے ہیں:

''بعض عربی الفاظ کے آخر میں الف کی آواز ہے، مگر وہاں بجائے الف کے 'ی' اور 'واؤ' لکھی جاتی ہے اور اس پر چھوٹا الف (الف مقصورہ) نشان کے طور پر بنا دیا جاتا ہے (اسے کھڑا زبر بھی کہتے ہیں) جیسے: ادنیٰ، اعلیٰ، ربوٰ ، ... مگر اس قبیل کے کئی الفاظ اردو میں پورے الف سے رائج ہیں جیسے: تماشا، تقاضا، ربا، مدعا وغیرہ...(کئی الفاظ دونوں طرح سے لکھے جاتے ہیں) ایسے لفظوں کا املا اس طرح مناسب ہوگا، جیسے:

ادنا، اعلا، تمنا، مدعا، مولا، دعوا، فتوا، معرا وغیرہ۔

باقی الفاظ اس طرح لکھنا مناسب ہوگا، جیسے:

اولیٰ، مقفیٰ، عقبیٰ، مجلس شوریٰ، تقویٰ، موسیٰ، عیسیٰ، تعالیٰ، یدطولیٰ، سدرۃ المنتہیٰ، وغیرہ۔

خیال رہے کہ 'استعفا' صحیح ہے، 'استعفیٰ' غلط ہے۔''

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ اصول کیا ہے جس کے تحت یہ تقسیم عمل میں لائی گئی ہے۔ اگر تو اس تقسیم کی بنیاد کسی ضابطے پر ہے تو وہ بیان کیا جانا چاہیے تھا۔ لیکن اگر یہ تقسیم قیاسی نہیں، بلکہ روایتی ہے تو پھر بیش تر الفاظ کی فہرست دے دی جاتی۔ مثلاً رشید حسن خان نے اپنی کتاب ''اردو املا'' میں صفحہ ۸۸ تا ۹۸ پر پہلی قسم (پورے الف والی) کی اچھی خاصی تفصیلی فہرست دی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک مختصر مضمون اس کا متحمل نہیں، لیکن پھر بھی کسی حد تک اہم الفاظ کی فہرست دے دی جاتی تو مناسب ہوتا۔

الف مقصورہ کے سلسلے میں انجمن ترقی اردو کی اصلاحِ رسم الخط کمیٹی کی تجاویز شائع شدہ رسالہ ''اردو' جنوری ۱۹۴۴ء میں بھی یہی تجویز کیا گیا ہے کہ: ''عربی ناموں اور عام الفاظ میں الف مقصورہ کے بجائے، پورا الف لکھا جائے۔ جیسے: ابراہیم، سلیمان، حیات، ربا اور اعلا، ادنا، مولا نا وغیرہ''۔ (رشید حسن خان، 'اُردو اِملا'، صفحہ ۴۷)

محترم ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی نے دوسری قسم کے تحت جو دس الفاظ و مرکبات لکھے ہیں، ان میں صرف آخری (سدرۃ المنتہیٰ) کو چھوڑ کر باقی تمام کا اِملا رشید حسن خان کی کتاب ''اُردو اِملا'' میں صفحہ ۴۸ پر (''قطعی طور پر طے شدہ'' کے الفاظ لکھ کر) پورے الف کے ساتھ درج کیا گیا ہے۔ لیکن میرے خیال میں ایسے الفاظ کے بارے میں انجمن ترقی اردو کی اصلاحِ رسم الخط کمیٹی کی تجاویز کے مقابلے میں املا اور موزِ اوقاف سیمینار منعقدہ ۲۵ تا ۲۷ جون ۱۹۸۵ء کی ذیلی کمیٹی کی سفارشات مندرجہ اخبار اردو مارچ ۱۹۹۹ء (پیراگراف نمبر ۱، صفحہ ۳) کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے، جن میں کہا گیا ہے:

> ''عربی کے ایسے الفاظ، جن کے آخر میں 'ی' پر چھوٹا الف (الف مقصورہ 'یٰ') آتا ہے، مگر پڑھتے وقت 'ی' کے بجائے الف پڑھا جاتا ہے، انھیں اردو میں بھی عربی املا کے مطابق لکھا جائے، کیونکہ قرآن پڑھنے والے سبھی لوگ اس سے مانوس ہیں۔''

بہتر یہ ہوگا کہ اصولاً تو انھیں بھی پورے الف سے لکھنے کو ترجیح دی جائے، لیکن ایسے قرآنی الفاظ کو الف مقصورہ کے ساتھ لکھنا بھی درست سمجھا جائے۔

پیراگراف '۵' میں کہا گیا ہے کہ سابقوں اور لاحقوں (بہ، چہ، کہ) کو ملا کر لکھنا بہتر ہوگا، مثلاً: بلکہ، چنانچہ، کیونکہ، جبکہ، بشرطیکہ، غرضیکہ، بخدا، بخوبی، بدقت، بہرحال، بدستور، بدولت وغیرہ۔

پیراگراف '۶' رحمٰن اور اسمٰعیل جیسے عربی الفاظ سے متعلق ہے اور بتایا گیا ہے کہ انھیں بھی پورے الف سے لکھا

جائے۔اس سے کمپوزنگ میں آسانی رہتی ہے۔اس تجویز کو بھی نظر انداز نہیں کیا جانا چاہیے۔

پیرا گراف '۷' میں بتایا گیا ہے کہ:

عربی اور ترکی کے کچھ الفاظ (اسی طرح غیر عربی، انگریزی، ہندی اور یورپی زبانوں کے الفاظ بھی) 'ہ' سے نہیں بلکہ الف سے لکھنا درست ہے، مثلاً:

''ملغوبا،قورما، سانچا، ڈاکیا،شوربا، ڈھانچا،معما، تماشا، بقایا،تمغا، مچلکا،حلوا، مربا، چغا،خون خرابا، ناشتا، خارا، داروغا، کٹورا،غنڈا، راجا، ڈراما، دھاکا، دھوکا، بھروسا، کلیجا، پتا، باڑا، بلبلا، تارا، گھونسلا، میلا، انگارا،فرما،انڈا، وغیرہ۔''

اس کے بعد کی عبارت نئے پیرا گراف میں آنی چاہیے تھی، جو درج ذیل ہے:

''بطور استثنا، بعض لفظوں کا املا یہ ہوگا (کیونکہ یہ اسی طرح رائج ہیں): نقشہ، کمرہ، زردہ، غبارہ، عاشورہ، خاکہ، بارہ، تکیہ، مہینہ، سموسہ، سقہ، ماشہ، تولہ، آزوقہ، پسینہ، روپیہ، وغیرہ۔''

اس فہرست میں سولہ الفاظ درج ہیں۔ ان میں سے نصف (۸) الفاظ تو ایسے ہیں جو رشید حسن خان نے الف سے لکھے ہیں (نقشا، زردا، غبارا، خاکا، مہینا، سموسا، پسینا، روپیا)۔ 'عاشورا، تولا، سقا' کو 'اخبار اردو' مارچ ۱۹۹۹ء میں پورے الف کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ 'تکیہ' کا لفظ ایک تو خانقاہ کے لیے مستعمل ہے، اسے ہائے مختفی ہی سے لکھا جاتا ہے۔ اس کے دوسرے معنی سرہانے کے ہیں۔ اس مفہوم میں اسے پورے الف سے 'تکیا' لکھا جائے تو زیادہ بہتر ہے۔ 'کمرہ' کو فرہنگ تلفظ (شائع کردہ مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۵ء) میں ہائے مختفی ہی سے لکھا گیا ہے، لیکن یہ بھی درج کیا گیا ہے کہ اصلاً یہ لفظ اطالوی (camera) ہے (صفحہ ۷۶۹)۔ اس لحاظ سے تو اس کا تلفظ 'کمرا' ہونا چاہیے، کیونکہ بولتے وقت بھی اس کا تلفظ پورے الف کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ اسی لیے 'فرہنگ عامرہ' نے اسے پورے الف کے ساتھ 'کمرا' ہی لکھا ہے (صفحہ ۴۹۸)۔ اب صرف تین الفاظ باقی رہ گئے ہیں: بارہ، ماشہ اور آزوقہ۔ ان کا تلفظ ہی ہائے مختفی کے ساتھ کیا جاتا ہے، اس لیے ان الفاظ کو اسی طرح لکھنا بہتر لگتا ہے۔

پیرا گراف '۸' اسمائے معرفہ سے متعلق ہے۔ درست وہی ہے جو محترم ہاشمی صاحب نے لکھا ہے۔ لیکن بعض لوگ امریکا، افریقا، بنگلا دیش بھی لکھتے ہیں۔ یکسانیت کے نقطۂ نظر سے بہتر یہی ہے کہ ہائے مختفی ہی سے لکھا جائے۔

پیرا گراف '۹' انتہائی ضروری اور مفید ہے۔ اس معاملے میں ہمارے ہاں بہت بے احتیاطی سے کام لیا جاتا ہے۔ یہ ایک افسوس ناک صورت حال ہے۔ ان الفاظ کو بولتے وقت کوئی شخص بھی ہمزے کی آواز ادا نہیں کرتا (سوائے مثلاً 'گئے' کے)۔ لیکن لیے، کیے، دیے، لیجیے، چاہیے وغیرہ لکھتے وقت نہ جانے کیوں اوپر ہمزہ لگا دیا جاتا ہے۔ یہ سراسر غلط ہے۔ اس کے بارے میں بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔ اس قاعدے کی جتنی تشہیر ممکن ہو، کی جانی چاہیے،

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

بلکہ میڈیا سے ایک مہم کے طور پر اس سلسلے میں مدد لی جائے۔

پیراگراف '۱۰' میں بھی ایک اہم بات بتائی گئی ہے کہ درست املا 'ان شاء اللہ' ہے نہ کہ 'انشاء اللہ'۔

پیراگراف '۱۱' میں بتایا گیا ہے کہ اضافت کے قاعدے میں مضاف کے آخری حرف کے نیچے زیر آتا ہے۔ جیسے ماہِ رمضان...... مگر جن لفظوں کے آخر میں یائے ساکن ہوتی ہے، اضافت کی صورت میں اس 'ی' کے نیچے زیر آئے گا (نہ کہ ہمزہ) مثلاً: مرضیِ خدا اور آزادیِ وطن وغیرہ۔ ایسے مقامات پر 'ی' کے بعد ہمزہ لکھنا مرزا غالب کے الفاظ میں 'عقل کو گالی دینا ہے'۔

پیراگراف '۱۲' میں ایک انتہائی اہم بات بتائی گئی ہے اور ایک ایسی بے احتیاطی کی طرف توجہ مبذول کرائی گئی ہے جس کا ارتکاب بہت زیادہ کیا جاتا ہے۔

''عربی جمع اور مصادر کے آخر میں ہمزہ آتا ہے۔ [لیکن] اردو میں ان کے آخر میں ہمزہ نہیں لکھیں گے، مثلاً: ابتدا، انتہا، ارتقا، التوا، ابتلا، استدعا، اولیا، انبیا، جہلا، وزرا، فقرا، حکما، غربا، املا، اخفا، القا، وغیرہ۔''

پیراگراف '۱۳' میں اسی قاعدے کا انگریزی الفاظ پر اطلاق بتایا گیا ہے کہ مارشل لا وغیرہ الفاظ کے آخر میں ہمزہ آنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

پیراگراف '۱۴' میں جملہ واضح نہیں۔ اسے اس طرح کی کوئی صورت دے دی جائے تو بات واضح ہو جائے گی:

''الف پر ختم ہونے والے الفاظ اگر مرکب اضافی میں مضاف بن کر آئیں تو انھیں لکھنے کی صحیح صورت یہ ہو گی: حکماے اسلام، ابتداے کار، یعنی 'ے' پر ہمزہ نہیں ہوگا، کیونکہ 'ے' اضافت کی علامت ہے۔'' اس کی جو توجیہ مضمون میں کی گئی ہے، مناسب نہیں لگتی۔ اور لوگوں نے بھی یہ قاعدہ بیان کیا ہے۔ اس میں لکھنے والے کے لیے تو ایک حد تک سہولت کا پہلو نکلتا ہے، لیکن یہاں تلفظ میں ہمزہ باقاعدہ موجود ہوتا ہے۔ اگر اسے درج بھی کر دیا جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہونا چاہیے۔ لطیفہ یہ ہے کہ اسی مضمون میں پیراگراف '۸' کے آغاز میں کمپوزر صاحب کی نوازش سے 'اسمائے معرفہ' لکھا گیا ہے۔ بلکہ میرے خیال میں تو پیراگراف '۱۵' والی صورت (مرکب عطفی) میں بھی جہاں ہمزہ بولا جاتا ہے، اسے لکھنے میں کوئی حرج نہیں ہونا چاہیے، مثلاً: شعراؤ ادبا، فقراؤ مساکین، آباؤ اجداد۔ لیکن کتاب و سنت جیسی مثالوں میں نہ تو ہمزہ موجود ہے، نہ بولا جاتا ہے اور نہ اسے لکھنے کا کوئی جواز بنتا ہے۔ تاہم سہولت اور یکسانیت کی غرض سے اگر یہ طے کر لیا جائے کہ ان صورتوں میں ہمزہ نہیں لگایا جائے گا تو یہ بھی ایک مناسب بات ہو گی۔

پیراگراف '۱۶' تا '۲۶' میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ انتہائی اہم اور مفید ہے۔ان امور کی اشاعت مسلسل کی جاتی رہنی چاہیے۔اللہ تعالیٰ محترم ڈاکٹر ہاشمی صاحب کو جزاے خیر دے، انھوں نے نہایت اہم امور کی طرف متوجہ فرمایا ہے، مثلاً پیراگراف '۱۶' میں قانونِ امالہ کا بیان ہے۔اس کے متعلق بے احتیاطی بہت عام ہے۔ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں: جن واحد مذکر لفظوں کے آخر میں 'ہ' یا الف ہو اور ان کے فوراً بعد تک، سے، کو، کا، کے، کی، میں، پر، وغیرہ میں سے کوئی حرفِ عاملہ آ جائے تو آخری 'ہ' یا الف کو 'ے' سے بدل دیا جاتا ہے، مثلاً آپ کے بارے میں (نہ کہ 'بارہ میں')، تمھارے بھروسے پر (نہ کہ 'بھروسا پر')، وغیرہ۔البتہ بعض الفاظ مثلاً امریکہ، دادا، نانا، چچا، ابا، ایشیا، برما، ہمالیہ، والدہ، جمیلہ، وغیرہ امالہ قبول نہیں کرتے۔

---

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

ساجد حمید

صبر کیا ہے، اسے کیسے حاصل کریں؟

(۷)

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

انبیا اور صبر

انبیا کی زندگی حصول صبر کے لیے ہمارے لیے اسوہ ہے۔ان کی داستان ہاے حیات اپنے اندر ہمارے لیے ایسی مثالیں رکھتی ہیں کہ جن سے ہمیں حوصلہ حاصل ہوتا اور بصیرت میں اضافہ ہوتا ہے۔ یہاں ایسا موقع نہیں کہ ہم ان واقعات کی تفصیل لکھیں، طالب اس کے لیے ان سیرتوں کے مطالعہ کو پیش نظر رکھے۔

ان کی تاثیر قرآن کے جیسی تو نہیں ہے، مگر ہمیں یہ فائدہ ضرور دیتی ہے کہ ان سے ہمیں انسانی زندگی کی مثالیں اور اس میں صبر کے اطلاقات کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔ انبیا سے ہماری محبت ہمارے دلوں میں چونکہ ایک تقدس سا پیدا کرتی ہے، جس وجہ سے ان کے واقعات اگر صحیح ہوں تو وہ بہت ہی زیادہ موثر بن جاتے ہیں۔ مگر یہاں ایک بات واضح کر دوں کہ واقعات سے دین اخذ نہیں کرنا چاہیے بس یہ چیز دیکھنی چاہیے کہ نیکی کرنے میں ان کا رویہ کیا تھا۔ دین کا ماخذ قرآن اور سنت ہیں۔ قصے کہانیاں نہیں۔ اس لیے کہ قصے کہانیاں محفوظ ہاتھوں سے ہم تک نہیں پہنچے۔ ان میں لوگوں نے بہت کچھ اپنی طرف سے ملا دیا ہے۔ اس لیے اب وہ حق اور باطل، دونوں کا مجموعہ ہیں۔

صحبت صادقین

قرآن مجید نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دور کے بدووں میں منافقت کو ختم کرنے کے لیے انھیں یہ مشورہ دیا کہ

'کونوا مع الصادقین' کہ ان لوگوں کے ساتھ رہا کرو جو قول و فعل میں سچے اور اپنے ایمان و عمل میں پختہ ہیں۔ ان کی صحبت اٹھانے سے درج ذیل فوائد حاصل ہوتے ہیں:

۱۔ ان کا فہم دین ہمیں حاصل ہوتا ہے۔

۲۔ ان کا لگاؤ، ہمارے اندر منتقل ہوتا ہے۔

۳۔ ان کی دنیا میں رہنے اور عمل کرنے کی بصیرت ہمیں حاصل ہوتی ہے۔

یہاں، البتہ ایک امکان اس بات کا ہے کہ آپ ایسے آدمی کا انتخاب کرلیں کہ جو صادق نہ ہو۔ اس چیز سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ آپ پہلے قرآن کے ساتھ اوپر بیان کردہ تعلق مطالعہ قائم کر چکے ہوں۔ وگرنہ ہر آنے والا آپ کو اپنے بہاؤ میں بہالے جائے گا۔ اس لیے کہ پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں، والی حالت آپ کو ہر راہ رو کے پیچھے لگادی گی۔ قرآن کا ترجمہ بار بار پڑھنے سے وہ ذہن بن جائے گا کہ وہ آپ کو اس مشقت سے بچالے گا کہ آپ ہر آدمی کی بات کے پیچھے لگ جائیں۔

معاشرتی تربیت

صبر کے حوالے سے ہر طبقہ میں مختلف پہلوؤں سے بے صبری یا برداشت پائی جاتی ہے۔ مثلاً متوسط طبقے کی عورت گھر کے کام کاج نہ کرے تو یہ ناقابل برداشت ہے۔ اور ایلیٹ کلاس کی عورت کام کرنا عار سمجھتی ہے اور اگر وہ کرلے تو یہ بڑا کارنامہ ہے۔ اس تربیت سے، جو ہر طبقہ اپنے لوگوں کی کرتا ہے، مختلف طبقات میں مختلف رویے وجود پزیر ہوتے ہیں۔ ایک دیہاتی غریب خاندان کے لوگ شاید ایک روٹی کے ٹکڑے پر لڑ پڑیں۔ مگر وہ ہوسکتا ہے کہ طوفان آنے پر آرام سے اپنے گھر کو گرتے ہوئے دیکھتے رہیں۔

اس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ بڑے پیمانے پر ایسی تربیت صبر کے پیدا کرنے کا سبب بن سکتی ہے۔ ہر خاندان کے سربراہ کو اپنے گھر میں تربیت کا ماحول بنانا چاہیے۔ جذبات کو کیسے کنٹرول کیا جاتا ہے۔ ان کا اظہار کب ہونا چاہیے وغیرہ جیسی باتیں ہر گھر کو اپنے ماحول میں تازہ رکھنی چاہییں۔

مثال کے طور پر، ہمارے اکثر لوگوں کی یہ تربیت ہی نہیں کی جاتی کہ کسی کا مذاق اڑا دینا، اس پر کوئی تبصرہ سا کر دینا کتنی بری بات ہے۔ ہمارے ہاں عام طور سے یہ بیماری ہر جگہ دیکھنے کو ملے گی۔ لوگوں کی معذوری پر ان کے نام تک پڑ جائیں گے۔ اس طرح کی چیزیں ہادم صبر ہیں۔ اس لیے کہ ان کا عام ہونا تکلیف کا باعث ہے۔ یہ تکلیف انتقام پر ابھارتی ہے اور معاشرے میں پھر تلخیاں وجود پزیر ہوتی ہیں۔ یہ تلخیاں چغلی، غیبت وغیرہ پر ابھارتی ہیں اور

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

انسان آہستہ آہستہ حق کے جادۂ مستقیم سے ہٹتا جاتا ہے۔

اس مقصد کے لیے ہمارے پیش نظر ایک تربیت گاہ کا قیام بھی ہے۔جس میں ہم یہ چاہتے ہیں کہ ایک بڑے پیمانے پر لوگوں کو ایسی تعلیم سے گزارا جائے کہ ان کے غلط بت ٹوٹ جائیں اور صحیح عقائد اور نظریات وجود میں آئیں۔ان کو مہذب انسان بنایا جائے۔ان کے کردار و سیرت کو سنوارا جائے۔

آفات صبر

اس باب میں ہم وہ اہم چیزیں زیر بحث لائیں گے جو ہمیں صبر کرنے میں ہمارے لیے مانع ہوتی ہیں۔

توکل سے محرومی

توکل اللہ پر اپنے معاملات کو ڈال کر اس کے فیصلوں پر مطمئن رہنے کا نام ہے۔جس آدمی میں توکل نہیں ہوگا، وہ صبر نہیں کر سکے گا۔اس لیے کہ خدا پر بھروسہ ہی وہ سہارا ہے، جس سے نفس مشکلات میں مطمئن رہتا ہے۔'رضیت باللّٰہ ربا' کی منزل جس نے پا لی ہو وہ مشکلات میں گھبراتا نہیں۔اس نے دراصل ایسی مضبوط چیز کو تھام رکھا ہے کہ جو اسے ہر اس وقت تھامے رکھتی ہے جب اس کے قدم ڈگمگانے لگتے ہیں۔

اللہ ہمارے بارے میں فیصلہ کرتے وقت کبھی ہمیں مشکل سے دوچار کرتے ہیں اور کبھی آسانی سے۔ان دونوں طرح کے فیصلوں میں اپنے معاملات کا والی وارث اللہ کو سمجھنا اور اس کی رضا پر قائم رہنے کی کوشش کرنا ہی وہ چیز ہے جس کو ہم توکل کہتے ہیں۔یہی چیز دراصل صبر کی سب سے بڑی مؤید و معاون ہے۔کیونکہ ایمان باللہ میں اصلاً مطلوب یہ ہے کہ:'قل آمنت باللّٰہ ثم استقیم'،اس بات کے قائل ہو جاؤ کہ میں ایمان لایا اور پھر اس پر قائم رہو۔

خدا پر عدم اعتماد

خدا کی ذات اس دنیا میں ہر نیکی کے لیے ایک بڑا سہارا ہے۔اس کے انکار اور اس پر بے اعتمادی کی بنا پر شاید ہی کوئی شخص نیکی پر قائم رہ سکے۔خدا پر اعتماد دراصل بے عقلی اور اندھے اعتقاد سے پیدا نہیں ہوتا، بلکہ اس کے لیے خدا پر سوچا سمجھا ایمان اس کی ذات کا تعارف، اس کی صفات و سنن کا علم ناگزیر ہے۔اگر یہاں پر غلطی ہو گئی تو آدمی وقتاً فوقتاً صبر سے محروم ہوتا رہے گا۔مثلاً بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ نیکی کریں گے تو ہم پر مصیبت نہیں آئے گی۔

یہ خدا کے بارے میں اس کی سنن کا غلط علم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ دنیا انعام کے لیے نہیں بنائی، بلکہ آزمایش کے لیے بنائی ہے۔ اس میں کسی نیکی کا لازماً اجر دینا نیکی کے بارے میں ایسی دلیل بن جانا ہے کہ جس کے بعد آزمایش آزمایش نہیں رہتی۔ خدا نے نیکی کو بس ایک عمومی سا غلبہ دے رکھا ہے، جو اس کائنات کے قائم بالخیر ہونے کی دلیل ہے، مگر یہ لازم نہیں ہے کہ کسی فرد کی نیکی کے بعد اس پر کوئی آزمایش نہیں آئے گی۔ انبیا کی زندگی اس کی بہترین مثال ہے۔ یہ لوگ معصوم عن الخطا تھے، مگر ان پر مصیبت کے ایسے ایسے پہاڑ ٹوٹے ہیں کہ قرآن کے مطابق رسول اور اس کے ساتھی پکار اٹھتے رہے کہ مدد کب آئے گی؟ (البقرہ ۲: ۲۱۴)

وہ آدمی جو نیکی اس لیے کر رہا تھا کہ اس پر کوئی مصیبت نہیں آئے گی۔ جب اس پر خدا کی کوئی آزمایش آئے گی تو وہ ایک طرف تو یہ کہ خدا سے مایوس ہوگا، اور دوسری طرف نیکیوں کو بھی فضول سمجھتے ہوئے ترک کر دے گا۔ صبر تو دور کی بات ہے، نیکی کا نام بھی شاید اس کے لیے فضول ہوگا۔ اس طرح کے لوگ ہمارے معاشرے میں بہت ہیں جنھوں نے کاروبار کی بہتری کے لیے نماز روزہ شروع کیا، مگر فائدہ نہ پا کر دین سے بددل ہوئے۔

اس لیے لازم ہے کہ قرآن کی روشنی میں اللہ کی صفات کو سمجھا جائے اور اس کی روشنی میں زندگی بسر کی جائے۔ یہ لازم ہے وگرنہ آہستہ آہستہ آپ کے دل سے ایمان نکلتا جائے گا۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

ان لوگوں کو عموماً بے صبر اور جذباتی دیکھا گیا ہے، جو خدا کو صحیح تصور کے ساتھ نہیں جانتے۔ مثلاً بعض خدا کو یوں سمجھتے ہیں جیسے نعوذ باللہ کوئی رشوت لینے والا ہو، ادھر آپ نے نیکی کی رشوت دی ادھر وہ رام ہو گیا۔ حالانکہ خدا بے نیاز اور غیر محتاج ہے۔ اسے اگر (نعوذ باللہ) ضرورت ہو بھی تو وہ خود ہر شے بنا سکتا ہے۔ اسے ہماری عبادت و ریاضت کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم ان شاء اللہ اسی سلسلۂ معالم السبیل کے ضمن میں ایک کتاب 'اللہ کون ہے؟' کے نام سے تحریر کریں گے۔ جس میں پاکستانی مسلمانوں کے خدا کے بارے میں غلط خیالات کی اصلاح ہوگی اور ان کو وہ معلومات ملیں گے جو زندگی کو صحیح معنی میں گزارنے کے لیے ضروری ہیں۔

خدا اس دنیا میں اجتماعیت کو نیکی کا اجر لازماً دیتا ہے۔ مثلاً اگر کوئی قوم اپنے اندر اجتماعی سطح پر حق کو قائم کر لیتی ہے تو اس سے اس میں خدا کی نعمتیں وافر ملنے لگیں گی اور دوسری اقوام میں اس کا سر اونچا ہوگا۔ لیکن ایک فرد کے ساتھ اللہ کا معاملہ یوں نہیں ہے۔ اس کی نیکیوں کا اجر اسے صرف آخرت میں ملے گا۔ یہاں بس اللہ اسے اتنا ہی دیں گے جتنا اس نے اس کے لیے لکھ رکھا ہے۔ نیکی کرنے سے دنیا میں اجر صرف یہ ہے کہ اس سے معاشرت میں خیر زندہ رہتا اور پنپتا ہے۔ لیکن یہ لازم نہیں ہے کہ اسے دنیا میں اجر ملنے لگے۔ یہ اسی صورت میں لازم ہوتا ہے، جب آخرت میں

اس کا کوئی حصہ نہ ہو۔

عدم ابتغاے رب

اللہ کی رضا کے بجائے ہمارا مطمح نظر اگر یہ بن جائے کہ ہم نے دنیا والوں کو خوش کرنا ہے، اور ہم نیکی کریں تو لوگ بھی اس کے جواب میں ہمارے ساتھ نیکی کریں، یہ چیز بھی ہادم صبر ہے۔ اس لیے کہ آپ ہر وقت نیکی پر قائم نہ رہ سکیں گے جب لوگ آپ کے ساتھ آپ کی توقع کے مطابق پیش نہیں آئیں گے۔ خود یہ چیز بھی کوئی نیکی نہیں ہے کہ آپ دنیا میں صلہ واجر کے لیے نیکی کریں۔ اصل مطلوب یہ ہے کہ آپ اللہ کی رضا کے لیے نیکی کریں، تاکہ آپ آگے کی توقع میں دنیا سے بے نیاز رہیں۔ اور یہ بے نیازی یقیناً زیادہ باعث اجر اور حوصلہ وتقویت کے لیے بہت مفید ہے۔

قرآن مجید نے حج کو جانے والے دو گروہوں کا ذکر کیا ہے، ایک وہ جو دنیا کے لیے ہی سفر کرتے ہیں، اور دوسرے وہ جو آخرت کی فلاح کے لیے سفر کرتے ہیں اور اللہ سے دنیا میں خیر اور بھلائی کے طالب رہتے ہیں۔ یہی دوسرے لوگ ہی اصل میں ثابت قدم لوگ ہیں۔ انھیں دنیا میں اجر پانے کی توقع چونکہ نہیں ہوتی، وہ آخرت کے لیے عمل کر رہے ہوتے ہیں، اس لیے اگر کہیں غربت وتنگ دستی ستاتی بھی ہے تو ان کی نیکیوں میں ازدیادہی کا باعث بنتی ہے۔

صحابہ کے بارے میں آتا ہے کہ جب جنگ کا موقع آتا تو ان کے ایمان میں اضافہ ہوتا، مگر منافقین جن کی نظر دنیوی منفعت پر لگی رہتی ہے، وہ اس سے گھبراتے اور اس ظاہری ایمان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتے، جس کے سہارے پر وہ مسلمانوں کی صف میں شامل ہوئے ہوتے تھے۔ ٹھیک یہی حالت دنیا میں طالب اجر کی ہے، جیسے ہی منفعت ختم ہوتی ہے تو وہ نیکی سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ ہم آپ کو یہ کوشش کرنی ہے کہ ہمیشہ اپنے اندر اس محرک عمل کو زندہ رکھیں کہ ہمیں اللہ کی رضا کے لیے کام کرنا ہے۔ یہی چیز عند اللہ باعث اجر ہے، اور اسی سے ایمان وعمل میں صبر واستقامت آتی ہے۔

عجلت پسندی

قرآن مجید میں بے شمار مواقع پر صبر عجلت کے متضاد معنی میں آیا ہے۔ ہم جن مواقع پر عجلت کا شکار ہو جاتے ہیں، وہاں بالعموم بے صبری دکھاتے ہیں۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ ادھر ہم دعا کریں اور ادھر پوری ہو جائے۔ اسی طرح کسی سے کوئی تقاضا ہو، کوئی کام نکالنا ہو، جب ہم جلدی میں پڑ جائیں تو بے صبری کی خطا سرزد ہوتی ہے۔ مثلاً ہمارے کسی

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

بھائی نے کوئی غلط بات ہم سے منسوب کر دی تو ہم فوراً اس سے انتقام لینے کی کوشش کرتے ہیں۔ حالانکہ پہلے لازم ہے کہ ہم یہ جانیں کہ بات کیا ہے، کس نے کہی ہے، ہمیں غلط بات تو نہیں پہنچی۔ یا اسی طرح خدا کی طرف سے جو مصیبت اور غم نازل ہوا ہے وہ جلدی نہ ٹلنے پر ہم مایوس ہو جاتے ہیں حالانکہ ہوسکتا ہے کہ اس میں ہمارا ہی قصور رہا ہو۔ پرہیز اور حفظان صحت کا ہم خیال نہ رکھیں اور خیال کریں کہ اللہ ہم سے ناراض ہو گیا ہے۔ اس نے مجھے ہی اس مصیبت کے لیے چن لیا ہے۔ وغیرہ۔

اپنے اندر سے ایسے داعیات کو قابو میں رکھنا چاہیے، جو ہمیں عجلت میں مبتلا کرتے ہیں۔ مثلاً حرص، طمع، غصہ، نفرت اور غیر متوازن محبت وغیرہ ان داعیات میں سے ہیں جو انسان کو عجلت میں ڈال دیتے ہیں۔ چنانچہ یہ عجلت ہم سے ایسے اقدامات کرا دیتی ہے کہ ہم مؤقف خیر و حق سے ہٹ جاتے ہیں۔ کسی کو مارنا، ظلم کرنا، خدا کی حدود سے متجاوز ہونا، یہ سب پھر وجود میں آتا ہے۔

بے خبری

صبر کو نقصان پہنچانے والے امور میں سے ایک چیز یہ بھی ہے کہ ہمیں ہر معاملہ کی حقیقت کا علم نہیں ہوتا۔ ہم اس کے بہت سارے پہلوؤں سے ناواقف ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے ہم غصہ میں آسکتے ہیں اگر ہمیں اس کی حقیقت کا علم ہو جائے تو ہمیں نہ اتنا دکھ ہو اور نہ اتنی بے صبری ہی پیدا ہو۔ یہ عام طور سے دیکھا گیا ہے کہ جب کوئی انتہائی تکلیف کے بعد وفات پاتا ہے تو لوگ بالعموم یہ کہتے ہیں شکر ہے کہ اس کی تکلیف سے جان چھوٹ گئی۔ حالانکہ وہی آدمی اگر حالت صحت میں دنیا سے رخصت ہوتا تو انھی لوگوں کا بین کئی دن جاری رہتا۔

وفات پانے والے بیمار کی اس تکلیف کا ہمیں علم ہوتا ہے، مگر ایسی بہت سی تکالیف، مشکلات اور معاملات ہوتے ہیں جو ہمارے لیے پردۂ غیب میں ہوتے ہیں۔ ان کا پوشیدہ رہنا خود ہمارے بھلے کے لیے ہوتا ہے۔ جیسے واقعۂ موسیٰ و خضر میں کچھ چیزیں غیب کی آپ علیہ السلام پر کھول دی گئی ہیں، جو ہم پر بالعموم غیب میں رہتی ہیں۔ ہمیں نہیں معلوم ہوتا کہ مرنے والے کو کس عذاب سے بچا لیا گیا ہے۔ وہ کون سی مشکل میں پڑنے والا تھا، یا وہ کیا کر گزرنے والا تھا وغیرہ۔

قرآن نے قصۂ خضر سنا کر ہمیں یہی بات سکھائی ہے کہ حادثات بھی اپنے بطن میں خیر کے حامل ہوتے ہیں۔ دنیا میں کوئی چیز بھی الل ٹپ نہیں ہو رہی ہوتی۔ ہر چیز ایک قاعدے ضابطے اور حکمت الٰہی کے تحت اور اسی کے اذن سے ہو رہی ہوتی ہے۔ وہ جس چیز کو وجود بخشتا ہے، وہ آزمایش سمیت کئی قسم کے خیر وجود پزیر کرتی ہے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

اسی کی روشنی میں ہمیں یہ بھی معلوم رہنا چاہیے کہ خدا کے معاملات کی طرح دنیا میں انسانوں کے معاملات میں سے بھی بیش تر پردۂ غیب میں ہوتے ہیں۔ کسی کے دل کے خیالات، اس کے محرکات اور دبے جذبات کا صحیح ادراک ہمارے لیے ممکن نہیں ہوتا۔ ہم اٹھتے ہیں اور ناراض ہو جاتے ہیں، حالانکہ دیکھنا یہ چاہیے کہ معاملہ کیسا ہے، کیوں ہوا ہے۔ میرے ساتھ ایک معاملہ ایسا ہوا کہ جس سے مجھ پر زندگی کی کئی گرہیں کھلیں۔ مجھ سے میرے ایک شاگرد نے میری ایک کتاب کے بارے میں پوچھا کہ کہاں سے لی ہے۔ میں نے اس سے کہا کہ یہ مجھے کسی نے تحفہ دیا ہے۔ ایک اور شاگرد نے اسی کتاب کے بارے میں پوچھا کہ یہ کتاب کتنے کی لی ہے۔ میں نے کہا پانچ سو روپے کی۔ دوسرے جواب سے یہ تاثر مل رہا ہے کہ شاید یہ کتاب میں نے خود خریدی ہے۔ ان دونوں شاگردوں سے کسی موقع پر جب بات ہوئی تو انھیں لگا کہ شاید میں نے جھوٹ بولا ہے۔ چنانچہ کچھ عرصہ تک یہ بات ان کے دلوں میں چھپی رہی، مگر کسی موقع پر انھوں نے اس کی وضاحت طلب کر لی تو میں ہنسے بغیر نہ رہ سکا۔ اس لیے کہ دونوں جملے سچ بھی ہیں اور ایسے بھی ہیں کہ متضاد دکھائی دیتے ہیں۔ میں نے ان سے کہا کہ یہ پوچھنے کا عمل تم نے بہت اچھا کیا ہے۔ دراصل میں اور میرا ایک دوست بازار میں تھے کہ یہ کتاب اس نے مجھے خرید کر تحفۃً دی۔ اب چونکہ میرے سامنے ہی خریدی گئی تھی اس لیے مجھے قیمت کا بھی علم تھا۔ اس لیے جس نے مجھ سے قیمت پوچھی اس کو میں نے قیمت بتا دی۔ لیکن قیمت بتانے سے ان کو یہ لگا کہ شاید میں نے خود خریدی ہے۔ جبکہ میں نے دوسرے شاگرد کو بتایا تھا کہ مجھے یہ تحفہ میں ملی ہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

اس واقعہ سے یہ حقیقت مجھ پر کھلی کہ دنیا میں کتنے ہی ایسے سچ ہوں گے، جن پر جھوٹ کا گمان ہوا ہوگا، جن سے لڑائیاں اور ناچاقیاں وجود میں آئی ہوں گی۔ کتنے ہی کام نیکی کی نیت سے کیے گئے ہوں، مگر برے لگنے کی وجہ سے برائی شمار کر لیے گئے ہوں گے۔ کتنے ہی محبت کے بول ہوں گے جن میں نفرت کو محسوس کیا گیا ہوگا، کتنے ہی نصیحت کے جملے ہوں گے جن کو محض نقد و اعتراض کے معنی میں لیا گیا ہوگا۔ کتنی ہی امداد کی کوششیں ہوں گی جن کو احسان کرنے کے مفہوم میں لیا گیا ہوگا۔ کتنے ہی منصفانہ فیصلے ہوں گے جن کو جانب داری کے معنی میں لیا گیا ہوگا۔ غرض یہ ایک حقیقت ہے کہ یہ دنیا غیب ہاے گوناگوں کا مجموعہ ہے۔ جس کی حقیقت قیامت ہی کو کھلے گی۔ یا کچھ ان لوگوں پر جو قرآن میں سورۂ حجرات کے حکم کے مطابق کوئی اقدام کرنے سے پہلے تحقیق کر لیا کرتے ہیں۔

اس تفصیل سے ہمیں یہ بات معلوم ہوئی کہ بے صبرے ہونے کے بجائے کوشش کرنی چاہیے کہ جن معاملات سے ہمیں رنج و تکلیف پہنچی ہے، ان کی حقیقت جاننے کی کوشش کریں شاید وہ حادثہ حادثہ نہ ہو، بلکہ ایک خوش گوار عمل

ہو جو ہمارے لیے بہت سے خیر اپنے ہمراہ لا رہا ہو۔

دوسرے کا حق

دنیا میں معاملات کرتے وقت ہمیں صبر سے ہٹانے والی ایک چیز یہ بھی ہے کہ ہم دوسروں کے حقوق کا صحیح شعور نہیں رکھتے اور ان کو اہمیت دیتے ہیں۔ دوسرے بھی انسان ہیں، ان کے بھی احساسات و جذبات ہیں، وہ بھی غلطی کر سکتے ہیں۔ ان کے ساتھ بھی دنیوی ضروریات لگی ہیں۔ ان کے بھی بیوی بچے اور مشکلات ہیں، ان کے اندر بھی تمناؤں کے سمندر حدود شکنی کو بے تاب ہیں۔ دوسرے سے معاملہ کرتے وقت ہمیشہ ان امور کا خیال رکھیں کہ وہ بھی ہماری طرح ان چیزوں سے دوچار ہیں۔

نقد و اصلاح اور تادیب و تنبیہ میں ہمیشہ اس بات کو خیال میں رکھیں کہ ہمیں ایک انسان سے معاملہ ہے۔ بعض لوگ اپنے ملازمین اور ماتحتوں کے ساتھ ایسا سلوک کرتے ہیں کہ جیسے بھلے لوگ جانوروں کے ساتھ بھی نہیں کرتے۔ اسی طرح لین دین اور دوسرے معاملات میں بھی ہم ہمیشہ حدود سے ناآشنا رہتے ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک واقعہ اوپر گزر چکا ہے، جس میں آپ نے قرض دینے والے کا یہ حق تسلیم کیا کہ جس کا کچھ لینا بنتا ہے، اسے کچھ کہنے کا حق ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ حق بھی حق کے دائرے ہی میں ہونا چاہیے۔ اس آدمی نے حدود سے تجاوز کیا، مگر آپ نے اس کے باوجود یہ کہا کہ ایسا کرنے و کہنے کا اسے حق تھا۔ اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس کی جگہ پر ہوتے تو یقیناً مانگنے ہی نہ جاتے، لیکن جو مانگنے آ گیا ہے، اسے مانگنے کا تو حق ضرور ہے، مگر اذیت دینے اور تنگ کرنے کا نہیں ہے۔ آپ نے چونکہ اس کے پیسے دینے تھے، اس لیے آپ نے اس کی اس اذیت کو بھی معاف کر دیا۔

نیکی کو حقیر جاننا

تجربہ اس بات پر گواہ ہے کہ جو لوگ نیکیوں کو بے پروائی سے لے لیتے ہیں، وہ شروع میں تو چھوٹی چھوٹی نیکیوں سے بے پروائی کرتے ہیں، مگر آہستہ آہستہ وہ بڑی نیکیوں سے بھی بے پروا ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ ان میں نیکی کا رجحان اور اس کی طرف میلان کا خاتمہ غالب آتا چلا جاتا ہے۔ پھر آدمی کا ذہن کچھ اور طرح سے سوچنے لگ جاتا ہے۔ پھر ایک وقت وہ بھی آجاتا ہے کہ ہر نیکی اسے اس کے راستے کی رکاوٹ دکھائی دیتی ہے۔ اور ہر چیز کو وہ حاصل کرنے کے لیے ہر طرح کے ہتھکنڈے استعمال کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ پھر نیکی کی جگہ بدی آتی چلی جاتی ہے اور ہر چیز کو وہ الٹ نگاہ سے دیکھنے لگ جاتا ہے کسی منصب پر ہو تو فرعون بن جاتا ہے اور عوام میں سے ہو تو غنڈہ و بدمعاش بن جاتا ہے۔ اس سب کچھ کی ابتدا اس وقت ہوئی تھی جب اس نے پہلے پہل کسی نیکی کو حقیر خیال کیا تھا۔

دراصل جب آدمی ایک نیکی چھوڑتا ہے تو خانۂ خالی را دیومی گیرد کے اصول پر برائی اس کی جگہ لیتی چلی جاتی ہے۔ آدمی کے سینے میں اللہ نے ہر نیکی کے لیے ایک غیرت (نفس لوامہ) رکھی ہے۔ یہ غیرت پہلے پہل بہت زیادہ ہوتی ہے۔ مگر بار بار برائی کرنے سے یہ غیرت آہستہ آہستہ کم موثر ہوتی چلی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ ہم ضمیر کی سرزنش کا بالکل اثر قبول نہیں کرتے۔ اس غیرت کی بے تاثیری دراصل ساری برائیوں کی جڑ ہے۔ اسی سے بعدازاں صبر میں کمی آتی ہے اور آدمی ویسا بن جاتا ہے جیسا ہم نے لکھا ہے۔

اگر آدمی کچھ نیکیوں کے بارے میں غیور رہے اور کچھ کے بارے میں غیرت میں کمی آ جائے تو اس صورت میں وہ ایک غیر متوازن آدمی بن کر رہ جاتا ہے۔ جو بعض معاملات میں صابر نظر آئے گا اور بعض میں غیر صابر۔

صبر کے چند پہلو

اللہ کے بارے میں بدظن نہ ہونا

جب آدمی پر مشکلات آ جائیں، اور وہ گردشوں میں گھر جائے تو اسے سب سے زیادہ جس بات کا دھیان رکھنا ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس مصیبت سے یقیناً میرا بھلا چاہتے ہیں۔ یہ بات ہم اوپر کی بحث میں اچھی طرح سمجھ آئے ہیں کہ مشکلات سے اللہ ہمارا بھلا کس طرح چاہتے ہیں۔ مشکلات آئیں تو ہمیں اللہ کے اور قریب لے جائیں۔ اسی بات کو احادیث مبارکہ میں 'رضیت باللّٰہ ربا' کے الفاظ سے بیان کیا گیا ہے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

شرک نہ کرنا

اوپر والے مطلوب رویے ہی کا یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ آدمی شرک میں مبتلا نہ ہو۔ مشکلات میں کبھی کبھی آدمی پر یہ وقت آ جاتا ہے کہ جب لوگ اسے یہ بتاتے ہیں کہ فلاں شخص ہر مراد پوری کر دیتا ہے اور فلاں ''باباجی'' ہر مشکل حل کر دیتے ہیں تو آدمی یہ خیال کرنے لگ جاتا ہے کہ شاید اللہ تو یہ نہیں کرے گا تو یہ بزرگ یقیناً ایسا کر دیں گے۔ یہیں سے شرک کا وہ سارا بازار گرم ہوتا ہے جس سے حق کی شاہ راہ سے ضلالت کی پگڈنڈیاں نکلتی ہیں۔

حق پر قائم رہنا

مشکلات سے بارہا یہ بات سامنے آ جاتی ہے کہ ہمارا موقف کسی بات کے بارے میں غلط تھا۔ اس کی غلطی واضح ہونے کے بعد آدمی کا صبر یہ ہے کہ حق پر قائم رہنے کے لیے غلط رائے کو ترک کر دے۔ اور یہ خیال ہرگز نہ کرے کہ

میں نے اتنے لوگوں کے سامنے یہ بات کئی مرتبہ دہرائی ہے تو آیا اب میں اس سے رجوع کرلوں۔ نہ یہ کہے کہ میں نے اتنی محنت سے یہ سلسلہ چلایا تھا، کیا اب اسے ختم کردوں، یا یہ سوچے کہ میں نے پچھلے سالوں سے اسی نہج پر اتنا بڑا ادارہ قائم کر رکھا ہے یا اتنے لوگوں کو اس بات پر جمع کرلیا ہے تو حق کا اعتراف تو کرلوں، لیکن یہ سب کچھ کہیں بکھر نہ جائے۔

یہود کا قضیہ قرآن میں بڑی تفصیل سے آیا ہے۔ ان کی مذہبی پیشوائی عربوں میں مسلم تھی۔ انھوں نے قریش کو امی کہہ کہ انھیں اپنے تابع بنا رکھا تھا۔ تاکہ وہ ان کے زیراثر رہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کے بعد یہود کے لیے یہی سوال ابھر کر سامنے آیا کہ اگر انھوں نے اس نبی امی کو مان لیا تو ان کی مشیخت و پیشوائی جاتی رہے گی۔ چنانچہ قرآن نے ان سے کہا کہ حق پر قائم رہنا چاہتے ہو تو صبر اور نماز سے مدد لو۔ یعنی مشیخت و پیشوائی جاتی ہے تو اس پر صبر کرو، اس لیے کہ اس کے بعد تمھیں حق پر قیام کی نعمت حاصل ہوگی۔

محرکات عمل

حق پر قائم رہنے میں صبر کا تقاضا یہ بھی ہے کہ ہم اپنے محرکات عمل کو درست رکھیں۔ جو کام دنیا کے لیے کرنا ہے اسے دنیا کے لیے کریں اور جو کام آخرت یا رضاے الٰہی کے لیے کرنا ہے، اسے اسی نیت سے کریں۔ اگر آپ کی نیت درست نہیں ہے تو گویا آپ نے صبر کا ایک بڑا حصہ ہاتھ سے جانے دیا۔ آپ نے مشکلات میں صبر کیا، مگر محض اس لیے کہ آپ کو دنیا صابر کہے، تو آپ دراصل حق پر قائم نہیں رہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

غلطی کا اعتراف

مشکلات میں بعض اوقات ایسی مشکل بھی سر پر آ پڑتی ہے جیسی مشکل سیدنا یوسف علیہ السلام کے بھائیوں پر آئی جب انھیں سیدنا یوسف کا سامنا کرنا پڑا کہ وہ ان کے وہی بھائی ہیں جنھوں نے انھیں کنویں میں پھینکا تھا۔ اور خود ان کے سامنے ان پر الزامات لگائے تھے۔ ایسے موقع پر صبر کا تقاضا یہ ہے کہ اپنی غلطی کا اعتراف متعلقہ لوگوں کے سامنے کرلیا جائے۔

مایوس نہ ہونا

قرآن مجید میں مایوس ہونے کو کفر کرنے والوں کا عمل بتایا گیا ہے۔ اور مصائب و مشکلات میں کفر وہی شخص کرتا ہے، جسے خدا کے بارے میں صحیح علم نہ ہو۔ وہ جذبات میں آ کر بھول جائے کہ اللہ اس سے کیا چاہتا ہے۔ صبر کا تقاضا یہ ہے کہ آدمی مصائب میں اللہ کے اگلے فیصلے کا مایوس ہوئے بغیر انتظار کرے۔ آج وہ جس مصیبت میں مبتلا کیا گیا

ہے، وہ کل ہوسکتا ہے کہ اس کے لیے ایک روشن مستقبل لے کر آ رہی ہو۔ اور اگر کل روشن مستقبل نہ بھی آئے تو اس کا مطلب یہ ہے اگر وہ خدا کے ایمان سے محروم نہ ہوا اور ایسی مشکل میں بھی حق پر قائم رہا، اخلاق اور نیکی کو ضائع نہ کیا تو اسے پھر جنت میں ایسا اجر ملنے والا ہے کہ دنیا کے کئی خوش حال اس پر رشک کریں گے۔

لوگوں کے بارے میں بدگمانی نہ کرنا

جب ہمیں کوئی تکلیف اپنے قریب رہنے والے لوگوں سے ملتی ہے تو ہم ان کے بارے میں طرح طرح کی باتیں سوچنے لگتے ہیں۔ حالانکہ بعض اوقات دوسرے لوگ ہماری بھلائی میں کچھ کرنا چاہتے ہیں، مگر ان کی بھلائی ہمارے لیے نقصان دہ ہو جاتی ہے۔ تو ایسے موقع پر ہمیں ان کے بارے میں برے گمان نہیں کرنے چاہییں۔ صرف اسی حد تک ہمیں ان کے بارے میں رائے بنانی چاہیے جتنی معلومات ہمارے پاس ہوں۔ قرآن مجید نے اس بارے میں ہمیں یہ فرمایا ہے:

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ اِنَّ السَّمْعَ وَ الْبَصَرَ وَ الْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا. (بنی اسرائیل ۱۷:۳۶)

''وہ موقف مت اختیار کرو جس کا تمھارے پاس نہ علم ہو، (اور نہ بنیاد)۔ اس لیے کہ کان آنکھ اور دل سب سے باز پرس ہونی ہے۔''

دوسرے موقع پر قرآن مجید نے یہ بھی فرمایا ہے کہ رائے ان معلومات پر مبنی ہونی چاہیے، جو تحقیق شدہ ہوں۔ سنی سنائی باتوں پر عمل نہیں ہونا چاہیے۔ نہ کسی پر تحقیق کیے بغیر الزام دھرنا چاہیے اور نہ اس کے خلاف کوئی اقدام اس عمل کے بغیر ہونا چاہیے۔

بداخلاق نہ ہونا

اگر آدمی یہ یقین رکھتا ہو کہ اللہ کی مرضی کے بغیر کوئی اس کو ضرر نہیں پہنچا سکتا تو اس عقیدہ کا لازمی نتیجہ یہ نکلنا چاہیے کہ دوسروں کے ہاتھوں زک پہنچنے پر آدمی اخلاقی رویوں میں کمزور نہ ہو۔

وہ دوسروں کی صریح غلطی کے باوجود غم وغصہ کا اظہار بھی کرے تو اخلاق کے دائرے میں رہتے ہوئے کرے اور وہ آداب کو ملحوظ رکھے، دین وشریعت کا پابند رہے، عدل وانصاف کو ہاتھ سے نہ جانے دے۔

گالی گلوچ سے گریز

اخلاق کے تقاضوں میں سے ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ آدمی دوسروں کو گالی نہ دے۔ سورۂ حجرات میں ہمیں دوسروں کے برے نام رکھنے اور ان پر اتہام لگانے سے بچنے کا حکم دیا گیا ہے۔ گالی انھی دونوں کے بیچ میں آتی ہے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

کبھی گالی کی نوعیت برے نام کی سی ہوتی ہے اور کبھی الزام واتہام کی سی۔ یہ واضح رہنا چاہیے کہ قرآن کے نزدیک برے نام رکھنا فسق وفجور کے درجے کی چیز ہے۔ گالی بھی اسی دائرے میں آئے گی۔

غیبت وچغلی سے گریز

غیبت وچغلی بھی آدمی کے بغض وکینہ اور بری رائے کا ہی اظہار ہے۔ اگر آدمی صابر ہے، تو اسے چاہیے کہ وہ ان سے بھی گریز کرے۔ وہ ہمہ وقت اس سے بچا رہے۔ اگر کبھی شدت جذبات سے ایسا ہو جائے تو تلافی کی کوشش کرے۔

مغرور نہ ہونا

آدمی کو اللہ تعالیٰ اگر نعمتیں عطا کریں، اچھی شکل وصورت اسے دیں، اعلیٰ صلاحیتوں سے اسے نوازیں تو وہ مغرور ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اگر وہ کسی مشکل میں صحیح رویہ اختیار کر لے اور اسے محسوس ہو کہ وہ آزمایش میں کامیاب ہوا ہے۔ تو یہ چیز بھی باعث تکبر وغرور ہو سکتی ہے۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ ایسے موقعوں پر ہوشیاری سے اپنی حفاظت کرے۔

غرور وتکبر کا مطلب صرف اکڑ کر چلنا ہی نہیں ہے، بلکہ اس سے مراد دوسروں کو حقیر سمجھنا بھی ہے۔ مثلاً اللہ کی دی ہوئی نعمتوں پر آدمی اس شخص کو حقیر سمجھے جس کو اللہ ہی نے ان نعمتوں سے محروم رکھا ہے، تو یہ بات ایسی سنگین ہے کہ آدمی کو دوزخی بھی بنا دیتی ہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

بدلہ نہ لینا

صبر کا ایک لازمی تقاضا یہ بھی ہے کہ آدمی دوسروں کو ان کی خطاؤں پر معاف کر دیا کرے۔ ان سے بدلہ نہ لے۔ دوسروں سے بدلہ لینا ایک دنیوی عمل ہے۔ جس نے پورا پورا بدلہ لیا، وہ ایسا ہی ہے جیسا اس نے ایک سودا دے کر اس کی قیمت وصول کر لی۔ اس پر وہ کسی اجر کا مستحق نہیں ہے۔

لیکن جو شخص دوسرے کو معاف کر دے، وہ ایک دینی عمل سرانجام دیتا ہے۔ اسے اجر عظیم عطا ہوگا۔ جتنی بڑی خطا کو اس نے معاف کیا ہوگا، اتنا بڑا اجر اسے حاصل ہوگا۔ قرآن مجید کا مطالبہ یہ ہے کہ ہم نہ صرف معاف کر دیں، بلکہ اس کی برائی کا بدلہ بھلائی سے دیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں آتا ہے کہ آپ کی عادت حسنہ تھی کہ آپ گالیاں دینے والوں کو دعائیں دیتے، ان کی تیمارداری کو جاتے، ان کی خیر خواہی کرتے، ان کے کام آتے، چنانچہ وہ لوگ آپ کے اخلاق ہی کی وجہ سے مسلمان ہو جاتے تھے۔ قرآن مجید نے اس بات کو یوں واضح کیا ہے:

وَلَا تَسْتَوِی الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ، اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ، فَاِذَا الَّذِیْ بَيْنَكَ وَ بَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهُ وَلِیٌّ حَمِيْمٌ، وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا، وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ. (حم السجدہ ۴۱: ۳۴۔۳۵)

''برائی اور بھلائی برابر نہیں ہوسکتیں، تم برائی کو اس چیز سے دفع کرو جو بہتر ہے، تو تم دیکھو گے کہ وہ، جس کے اور تمھارے درمیان عداوت ہے، گویا وہ ایک سرگرم دوست بن گیا ہے۔ اور یہ (دانائی) نہیں ملتی مگر انھی لوگوں کو جو صابر (ثابت قدم) ہوتے ہیں، اور یہ (حکمت) نہیں ملتی مگر انھی کو جو بڑے نصیبہ ور ہوتے ہیں۔''

ان آیات سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ صبر کا تقاضا یہ ہے کہ آدمی برائی کا بدلہ نیکی سے دے۔ بعض لوگ اس آیت سے یہ سمجھتے ہیں کہ نصیبہ وری اللہ تعالیٰ کے انتخاب کا نام ہے۔ ایسا نہیں ہے۔ ہر وہ شخص نصیبہ ور ہوسکتا ہے کہ جو آخرت کی کامیابی کے لیے جینا سیکھ لے۔ قرآن مجید سورۂ عصر میں یہی کہتا ہے کہ جو ایمان لایا، اور اس نے نیک اعمال کیے اور 'تواصی بالحق' اور 'تواصی بالصبر' کا فریضہ سرانجام دیا تو وہ خسارے سے بچ گیا۔ یعنی وہی اچھے نصیبہ والا ہے۔ چنانچہ آدمی اگر آخرت کے لیے جینے لگے تو وہی نصیبہ ور ہے اور اسی کو وہ دانائی مل جاتی ہے جو اسے صابر بنا دیتی ہے۔ صبر اور آخرت کے لیے جینے والا ہی اس آیت کا نصیبہ ور اور صابر و حکیم ہے۔

اس درگزر اور صبر و دانائی کا نتیجہ آخرت کی نصیبہ وری ہے اور دنیا میں یہ کہ دشمن دوست بن جائے گا۔ اور اس دشمن کا خوف امن میں بدل جائے گا۔

خندہ پیشانی سے پیش آنا

اس درگزر کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ہم بس معاف کر دیں۔ بدلہ نہ لیں، مگر ہمیشہ کے لیے قطع تعلق کر لیں۔ یہ غلط ہو گا۔ آپ کے دل میں اس کے بارے میں خیالات کیسے بھی ہوں، آپ اسے خندہ پیشانی سے پیش آئیں۔ اسی کو حدیث میں صدقہ قرار دیا گیا ہے۔ جو آپ کے ساتھ نیکی کرتا ہے اور آپ اس کو مسکرا کر ملتے ہیں تو یہ تو ہر کوئی کر لیتا ہے۔ اصل مطلوب یہ ہے کہ ہم ان سے بھی مسکرا کر ملیں جو ہمارے لیے برائی کرتے پھرتے ہیں۔ اور دوسری طرف براہ راست یا بالواسطہ ان کی اصلاح کی کوشش بھی جاری رکھیں تاکہ وہ اپنی غلطی پر عادی نہ ہوں۔ یہ 'تواصی بالحق' کا تقاضا ہے۔ اس سے گریز کرنا بھی عدم صبر ہے، مگر یہ سب حکمت و دانائی سے ہونا چاہیے۔

احتساب نفس

صبر کا ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ آدمی جب بھی کسی صدمے سے دوچار ہو، یا دوستوں اور عزیزوں کی طرف سے برا

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

سلوک اس کے ساتھ کیا جائے تو اسے چاہیے کہ وہ ضبطِ نفس سے کام لیتے ہوئے اپنا احتساب کرے۔ یہ دیکھے کہ اس پر یہ ابتلا جو آئی ہے، وہ کیوں کر آئی ہے۔ اس کی کوئی غلطی ہے جس کی بنا پر خدا نے اسے بیدار کرنا چاہا ہے۔ یا اس سے کوئی گناہ سرزد ہوا ہے۔ جس پر خدا چاہتا ہے کہ ہم توبہ کر کے اس کی طرف رجوع کریں۔ یا میرے دوستوں اور عزیزوں کو میرے کسی رویے اور میرے کسی اقدام یا قول سے تکلیف پہنچی ہے۔ اگر آدمی ایسا نہیں کرے گا تو یا وہ کڑھنے میں لگا رہے گا یا دوسروں کے لیے ایسا ماحول بنا چھوڑے گا کہ وہ اس کے ہدف نقد اور طعن و تشنیع ہوں گے۔

وہ معاشرے میں بھی ایک تکلیف دہ شخص کی طرح جیے گا۔ اور آخرت میں دوسروں کو تکلیف دینے والا بنے رہنے کی وجہ سے سزا کا مستحق ہوگا۔ دوسروں پر زبان کھولنے سے پہلے اپنے دامن کے داغ شمار کرنے چاہییں۔ اور دوسروں پر نقد کرنے سے پہلے اپنے اوپر تنقید کرنی چاہیے۔ اس لیے کہ ہم خود بھی خطاؤں سے پاک نہیں ہیں۔

جیسے ہی ہمارے سامنے ہماری خطا آئے تو اسے درست کریں، معلوم ہو کہ ہم نے گناہ کیا تھا تو توبہ کریں۔ اور اگر ہمیں معلوم ہو کہ لوگوں نے میرے ساتھ یہ برا رویہ اس لیے اختیار کیا ہے کہ میں نے بھی ان کے ساتھ یوں اور یوں کیا تھا، تو ان سے معذرت کریں۔ اور اگر معلوم نہ ہو سکے کہ میرے بھائیوں نے میرے ساتھ جو برا سلوک کیا ہے، وہ کیوں کیا ہے تو پھر ان سے محبت اور عاجزی کے ساتھ پوچھ لیں کہ آپ نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا ہے۔ اگر ان کی غلط فہمی ہو تو اسے دور کر دیں، اگر وہ کسی غلطی کی نشان دہی کریں تو اسے تسلیم کرتے ہوئے معذرت کر لیں۔ اس رویے سے آپ کی زندگی میں ایک سکون آئے گا۔ آپ لوگوں کے لیے ایک اسوہ بنیں گے اور اگر آپ کی نیت درست ہوگی، آخرت میں اجر پانے کے لیے یہ سب کچھ کریں گے تو پھر آپ کے لیے آخرت میں ایک اجر عظیم منتظر ہوگا۔

جاہلوں سے اعراض

احتسابِ نفس میں صبر کے تقاضوں میں سے یہ بھی ایک تقاضا ہے کہ اگر آپ کا عقیدہ و عمل درست ہے۔ اور کچھ لوگ بلا وجہ یا اپنے نظریے کی بنا پر آپ کے درپے ہو گئے ہیں، تو اس صورت میں ان کے ساتھ الجھنے اور ان کے ساتھ لگے رہنے کے بجائے لازم ہے کہ آپ ان کی صحیح بات سمجھنے کی کوشش کریں، ان کے نقد کو اچھی طرح سمجھ لیں اگر اس میں کوئی جان ہے تو ضرور اپنی اصلاح کر لیں وگرنہ محض مذاق اور ٹھٹھوں پر نہ توجہ دینے کی ضرورت ہے، اور نہ دل جلانے کی۔ بہتیرے لوگ اپنا وقت اسی میں ضائع کر دیتے ہیں کہ اس نے یہ کہا ہے اور اس نے وہ۔ پھر اس کی صفائی دینے میں لگے رہتے ہیں۔ اگر ہم خود صحیح چل رہے ہیں، تو اس فکر میں نہیں پڑنا چاہیے کہ لوگ کیا کہیں گے۔ اگر کسی کو

غلط فہمی بھی ہو گی تو جلد یا بدیر دور ہو جائے گی۔ اگر آپ نے ویسا کیا ہے تو آپ کی صفائی اور اس کے لیے آپ کی جدو جہد رائیگاں جائے گی۔ اس لیے کہ اگر آپ غلطی کرتے ہیں، تو جلد یا بدیر سامنے آجائے گی۔

خیر خواہی

دوسروں کی خیر خواہی ہمیشہ اپنے پیش نظر رکھنا بھی صبر کا تقاضا ہے۔ بندۂ مومن دوسروں کے لیے بے ضرر ہے۔ اسے دوسروں کی برائی کے باوجود ان کے لیے خیر خواہ رہنا ہے۔ اس کے تقاضے درج ذیل ہیں:

۱۔ صحیح مشورہ دینا

۲۔ مشکل میں مدد کرنا

۳۔ حق اور صبر کی نصیحت کرنا وغیرہ

۴۔ ہمیشہ بھلا چاہنا

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: 'الدینُ النَّصِیحَۃُ لِلّٰہِ وَلِکِتَابِہِ وَلِرَسُولِہِ وَلأَئِمَّۃِ الْمُسْلِمِینَ وَعَامَّتِہِمْ ' دین اللہ، اس کی کتابوں، اس کے رسولوں، مسلمانوں کے حکمرانوں اور عام مسلمانوں کے ساتھ خیر خواہی کا نام ہے۔ یعنی ہماری خیر خواہی ان سب کے لیے ہے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

خلاصۂ بحث

یہ دنیا دارالامتحان ہے۔ ہمارا اصلی امتحان صبر ہی کا ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ ہم ہر حالت میں صحیح عقیدہ وعمل اور صحیح رویہ وسلوک پر قائم رہیں۔ صبر ہی کا صلہ جنت ہے۔ اسی صبر کا دوسرا پہلو شکر ہے۔ یہ دونوں مل کر دینی رویے کی تکمیل کرتے ہیں۔ شکر بندگی پر ابھارتا ہے اور صبر بے بندگی سے روکتا ہے۔ شکر نیکی کرنے کا نام ہے اور صبر برائی سے بچنے کا۔ شکر نیکی میں آگے بڑھنے کا نام ہے تو صبر اس پر قائم رہنے کا۔

دین اسلام کا سب سے بڑا مطالبہ یہی ہے۔ یہ اصل میں دین پر قائم رہنے، اخلاق کو قائم رکھنے اور صحت عقیدہ و عمل کو برقرار رکھنے کا نام ہے۔ یہی دراصل دین ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جب اللہ کی طرف سے آزمایش آئے تو ہم

۱۔ اسے امتحان سمجھیں۔

۲۔ یہ تسلی رکھیں کہ اس کا امتحان ہماری ہمت سے بڑھ کر نہیں۔

۳۔ یہ آزمایش ہمیں یا ہمارے ایمان کو ضائع کرنے نہیں آئی بلکہ اگر ہم ثابت قدم رہے تو دنیا میں ہمارے اندر

کی خامیوں کو دور کرنے، اعلیٰ اوصاف پیدا کرنے اور آگے بڑھانے کے لیے آئی ہے۔ اگر ہم ثابت قدمی دکھاتے ہیں تو آخرت میں بھی اجر عظیم کا باعث ہو گی۔

ہم لوگوں کے معاملات میں ان کے رویوں کو اپنے لیے اللہ کی طرف سے امتحان سمجھیں۔ اوپر والے نکات کے ساتھ ساتھ درج ذیل نکات کو بھی پیش نظر رکھتے ہوئے سارے معاملے پر غور کریں:

۱۔ اگر غلطی ہماری طرف سے ہے تو اسے درست کر لیں، اور ان سے مل کر اصلاح احوال کی کوشش کریں۔ اگر غلطی ان کی ہے تو ان سے درگزر کریں۔

۲۔ اگر آپ صحیح تھے تو اپنے کام، رویے اور نظریہ پر قائم رہیں۔

۳۔ برے رویوں، تبصروں میں الجھنے اور ان پر کڑھتے رہنے کے بجائے ان سے اعراض کریں، جذباتی قسم کے لوگوں سے جب معاملہ پڑے تو ان سے اعراض کریں۔

---

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com